چونکا دینے والی دلچسپ کہانیوں کا انتخاب

سہ ماہی
ڈائجسٹ

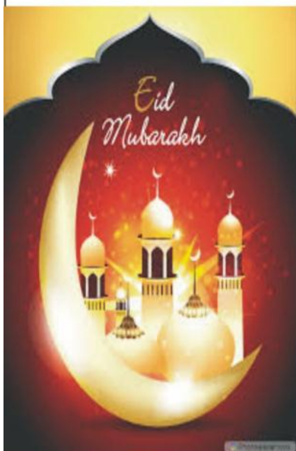
شاہین

سلانوالی
سرگودھا









رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ جریدہ

سہ ماہی

شاہین ڈائجسٹ

سلانوالی، سرگودھا

0300-2305767
0302-2305767
0306-9034595
Shaheendigest786@gmail.com

بانی وچیف ایڈیٹر: ملک این اے کاوش اعوان

ایڈیٹر: محمد ندیم عباس میواتی

معاون ایڈیٹر: ذکیر احمد بھٹی (سعودی عرب)

انچارج شعروشاعری: اظہر اقبال مغل

کمپوزنگ وڈیزائننگ: ملک این اے کاوش

فیس بک انچارج: انعم شہزادی

جلد:01 شمارہ:05 ستمبر 2017

خط وکتابت کا پتہ:

ملک این اے کاوش، محلّہ رحمت کالونی، کچہری روڈ، تحصیل سلانوالی

ضلع سرگودھا، پنجاب پاکستان

0300/0302-2305767

0306-9034595 Shaheendigest786@gmail.com



Kawish\Desktop\Graphic1.JPG not found.



☆ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کو خوشخبری سنا دو کہ ان کے لیے (نعمت کے) باغ ہیں۔ جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جب انہیں ان میں سے کسی قسم کا میوہ کھانے کو دیا جائے گا تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا۔ اور ان کو ایک دوسرے کے ہمشکل میوے دیئے جائیں گے اور وہاں ان کے لیے پاک بیویاں ہوں گی اور وہ بہشتوں میں رہیں گے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 25)

☆ بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے اس پر کچھ گناہ نہیں کہ دونوں کا طواف کرے۔ اور جو کوئی نیک کام کرے تو اللہ قدر شناس اور دانا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 158)

☆ پھر ان کے بعد چند ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو چھوڑ دیا۔ گویا اسے کھو دیا اور خواہشات نفسانی کے پیچھے لگ گئے۔ سو عنقریب ان کو گمراہی کی سزا ملے گی۔ (سورۃ مریم 19 آیت 59)

☆ اور وہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے اختیار میں کیا تاکہ اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ۔ اور اس سے زیور موتی وغیرہ نکالو جسے تم پہنتے ہو۔ اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں دریا میں پانی کو پھاڑتی چلی جاتی ہیں اور اس لئے بھی دریا کو تمہارے اختیار میں کیا کہ تم اللہ کے فضل و معاش تلاش کرو تاکہ اس کا شکر کرو۔ (سورۃ نحل 16 آیت 14)

☆ ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ یعنی ہر قسم کے جاندار اور فرشتے سب سجدہ کرتے ہیں اور وہ غرور نہیں کرتے۔ (سورۃ نحل 16 آیت 49)

☆ اور جو شخص سچی بات لے کر آیا اور جس نے تصدیق کی وہی لوگ متقی ہیں۔ وہ جو چاہیں گے ان کے لیے ان کے رب کے پاس موجود ہے۔ نیکوکاروں کا یہی بدلہ ہے۔ (سورۃ زمر 39 آیت 33 سے 34)

☆ اور دیکھنا شیطان کا کہنا نہ ماننا وہ تمہیں تنگ دستی کا خوف دلاتا اور بے حیائی کے کام کرنے کو کہتا ہے اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور رحمت کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ بڑی کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 268)

☆-----☆-----☆

قرآن و سنت کا احترام کرنا اور عمل کرنا ہم سب پر فرض ہے۔

خوشخبری

اگر آپ لکھاری، شاعر، کالم نگار ہیں یا اردو ادب کی دنیا سے بالواسطہ یا بلاواسطہ منسلک ہیں اور آپ اپنی کتاب شائع کروانا چاہتے ہیں تو اس کی کمپوزنگ کے لیے آج ہی رابطہ کریں۔ اس کے علاوہ آن لائن اور ہارڈ کاپی میں ڈائجسٹ، میگزین، کتابچے وغیرہ شائع کرنے والے حضرات اپنی مسودہ جات کی کمپوزنگ اور سیٹنگ کروانے کے لیے بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔ نہایت ہی مناسب فیس اور بہترین کام کی گارنٹی۔

نیز انٹرنیٹ پر اپنی کتاب یا ڈائجسٹ و میگزین یا دیگر مواد اپلوڈ کروانے کے لیے بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔ شکریہ۔

برائے رابطہ:

شہریار اسلم کمپوزر سنٹر، کچہری روڈ تحصیل سلانوالی، ضلع سرگودہا

ملک این اے کاوش اعوان: 0302-2305767

nakawish786@gmail.com

shaheendigest786@gmail.com

نمائندہ خصوصی اظہر اقبال مغل کا پاکستانی مشہور ایکٹریس ندا ملک سے انٹرویو

نمائندہ: السلام و علیکم!

ندا: وعلیکم السلام!

نمائندہ: کیا حال ہے کیسی ہیں آپ؟

ندا: ٹھیک اللہ کا شکر ہے میں۔

س: آپ نے اپنے کیریئر کا آغاز کب اور کہاں سے شروع کیا؟

ج: میں نے اپنے کیریئر کا آغاز ڈراموں/تھیٹر سے کیا۔



س: آپ نے اس فیلڈ ہی میں آنا پسند کیوں کیا؟

شوبز میں آنا میرا شوق تھا اس لیے اس طرف آئی۔

کیوں کہ دوسروں کو خوشی دے کر مجھے دلی طور پر مسرت ہوتی ہے۔

س: آپ کو کھانے میں کیا پسند ہے؟

جی کھانے میں کچھ خاص نہیں صرف اور صرف دالیں اور سبزیاں پسند ہیں۔

س: کوکنگ آتی ہے آپ کو کیا پکا سکتی ہیں؟

ج: جی کوکنگ کا شوق نہیں اور نہ ہی کوکنگ آتی اور میں آلو بہت اچھا بنا لیتی ہوں۔

س: اگر آپ ایکٹریس نہ ہوتی تو کیا ہوتی؟

ج: جی ایکٹریس نہ ہوتی تو ڈاکٹر ہوتی۔

س: آج کل جو ہو رہا ہے اس میں کوئی تبدیلی آنی چاہیے۔

ج: جی ہاں ضرور تبدیلی ہونی چاہیے۔ باقی پبلک بہتر طور پر بتا سکتی ہے کہ کیا تبدیلی ہونی چاہیے کیونکہ ہم لوگ پبلک کی ڈیمانڈ کے مطابق ہی کام کرتے ہیں۔

س: آپ اپنے کام سے مطمئن ہیں؟

ج: جی ہاں اپنے کام سے بہت زیادہ مطمئن ہوں کیوں کہ میں جہاں بھی جاتی ہوں عزت ملتی ہے اس عزت کو دیکھ کر لگتا ہے کہ لوگ میرا کام بہت پسند کرتے ہیں۔

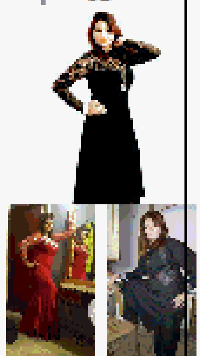
س: کوئی ایسی خواہش جو آج تک پوری نہ ہوئی ہو؟

ج: جی ایسی کوئی خواہش نہیں جو پوری نہ ہوئی ہو میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ جو چاہا وہ پایا۔

س: مستقبل میں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟

ج: مستقبل میں بہت کچھ کرنے کا ارادہ ہے دعا کریں اللہ مجھے میرے مقصد میں کامیاب کرے میں پاکستان کیلئے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔

س: اگر انڈیا جا کر کام کرنے کا موقع ملا تو کریں گی؟



ج: جی ضرور اگر انڈیا جا کر پاکستان کا نام روشن کرنے کا موقع ملا تو ضرور کام کروں گی۔

س: فلم میں کام بھی کبھی کریں گی؟

ج: جی ایک فلم کر چکی ہوں اگر مزید کام کرنے کا موقع ملا تو ضرور کروں گی۔

س: اگر فلم کام کرنے کا موقع ملا تو کس پاکستانی ہیرو کے ساتھ کام کرنا پسند کریں گی۔

ج: شان صاحب بہت ہی اچھے ہیرو ہیں شان صاحب کے ساتھ کام کر کے خوشی ہوگی اور ہاں اگر پاکستانی کرکٹر شاہد آفریدی صاحب فلموں میں کام کریں تو ان کے ساتھ کام کرنا پسند کروں گی۔

س: شادی کب کر رہی ہیں؟

ج: ابھی تو میں بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں اس لیے شادی کا ابھی کوئی ارادہ نہیں جب کروں گی تو سب کو بتا کر کروں گی۔

س: کس شخصیت سے بہت متاثر ہیں آپ؟

ج: جی سب سے پہلے تو مجھے پاکستانی ٹیم کے جیتنے پر بہت خوشی ہوتی ہے مجھے شہباز شریف صاحب بہت پسند ہیں میں ان کی بہت عزت کرتی ہوں۔

س: آپ کو وزیر اعظم بنا دیا جائے تو پہلا کام کیا کریں گی؟

ج: میں موجودہ لیڈرز کے ہوتے ہوئے تو ایسا نہیں سوچ سکتی۔

س: پاکستانی عوام کو کوئی پیغام دینا چاہیں گی؟

ج: پاکستانی عوام کیلئے یہی پیغام دینا چاہوں گی کہ دوسروں کیلئے جینا سیکھو اور اپنے ماں باپ کی عزت کرو۔

☆-----☆-----☆

مقصود انور (المعروف جانو بابا) سے نمائندہ خصوصی اظہر اقبال مغل کی دلچسپ گفتگو وانٹرویو

نمائندہ: السلام وعلیکم!

جانو بابا: وعلیکم السلام!

نمائندہ: کیا حال ہے آپ کا؟

جانو بابا: جی ٹھیک ہوں شکر ہے اللہ پاک کا۔

س: آپ نے اپنے کیرئیر کا آغاز کب اور کہاں سے شروع کیا؟

ج: میں نے اپنے کیرئیر کا آغاز سٹیج ڈرامہ سے کیا، لیکن اس سے پہلے بھی میں بطور ایکٹر کام کر چکا ہوں چونکہ میں تعلیم کے شعبہ سے وابستہ ہوں اس لیے مجھے ایکٹنگ چھوڑنی پڑی لیکن میرا شوق مجھے دوبارہ شوبز میں لے آیا۔

س: آپ نے اس فیلڈ ہی میں آنا پسند کیوں کیا؟

ج: بات پسند نا پسند کی نہیں ہے بات شوق کی ہے۔ جب انسان نے کام کرنا ہے کام ہی کرنا ہے چاہے وہ کسی شعبہ سے بھی ہو۔ میں ایک ٹیچر ہوں لیکن میرا شوق مجھے اس فیلڈ میں لے آیا۔

س: آپ کو کھانے میں کیا پسند ہے؟

مجھے سب کچھ پسند ہے کھانے میں لیکن دال چاول کے ساتھ قیمہ بھنڈی سلاد شوق سے کھاتا ہوں۔

س: کوکنگ آتی ہے آپ کو کیا اچھا بنا سکتے ہیں؟

ج: جی میں علم کی ہانڈی بہت اچھی بنا سکتا۔ کیوں کہ علم کی ہانڈی میں ڈال کر ایک طالب علم کو اس طرح پکاتا ہوں کہ وہ لفظ یہ تو ہو جاتا ہے

س: اگر آپ ایکٹر نہ ہوتے تو کیا ہوتے؟

ج: جی میں ایک ٹیچر ہوں، ایکٹر نہ ہوتا تو ٹیچر ہی ہوتا۔

س: آج کل جو کام ہو رہا ہے اس میں کوئی تبدیلی آنی چاہیے۔

ج: جی بہت زیادہ تبدیلی کی ضرورت ہے، کیوں کہ دنیا چاند پر پہنچ چکی ہے اور ہم آج بھی وہی کے وہی ہیں، کسی بھی کام میں تبدیلی سوچ سے ہوتی ہے، ہماری فلمیں آج بھی گنڈاسہ کلچر پیش کر رہی ہیں اور سٹیج ڈراموں سے ڈرامہ غائب ہو چکا ہے صرف ڈانس رہ گیا ہے اس لیے تبدیلی بہت ضروری ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم پاؤں پر ضرور کھڑے ہو جائیں گے۔



[illegible]

س: آپ اپنے کام سے مطمئن ہیں؟

ج: میں اپنے کام سے بالکل بھی مطمئن نہیں ہوں کیوں کہ مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے جو کہ میں کر نہیں پا رہا ابھی تو آغاز ہے۔

س: کوئی ایسی خواہش جو آج تک پوری نہ ہو سکی ہو؟

ج: جی شکر ہے اللہ کا جو اللہ سے مانگا وہ ملا۔

س: مستقبل میں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟

ج: مستقبل میں کلاسک آرٹ کامیڈی موویز بنانے کا ارادہ ہے اور ایک اکیڈمی بنانے کا ارادہ ہے۔ کیوں کہ پاکستان ٹیلنٹ کی دولت سے مالا مال ہے میں چھپے ہوئے ٹیلنٹ کو سامنے لانا چاہتا ہوں۔ اور فلم اور سٹیج کو ایک نئی سوچ دینا چاہتا

ہوں کہ ڈرامہ واقعی ڈرامہ لگے اور فلم کے ذریعے معاشرہ کی اصلاح ہو سکے، نہ کہ بیہودگی کو فروغ ملے۔

س: اگر انڈیا جا کر کام کرنے کا موقع ملا تو کریں گے؟

ج: میں ایک ایکٹر ہوں اور ایکٹر کا کام ایکٹنگ کرنا ہے۔ اس لیئے انڈیا کیا چیز ہے اگر ہالی ووڈ میں بھی کام کرنے کا موقع ملا تو ضرور کروں گا تا کہ میں پوری دنیا میں پاکستان کا نام روشن کر سکوں۔ کیونکہ ایک آرٹسٹ کیلئے پوری دنیا ہی سٹیج ہے۔

س: فلم میں کام کی آفر ہو تو کریں گے؟

ج: جی میں پہلے سے ہی فلم میں بطور ولن اور کامیڈین کام کر رہا ہوں۔

س: کس پاکستانی ہیروئن کے ساتھ کام کرنا پسند کریں گے؟

ج: مجھے کام کرنا ہے صرف کام مجھے کوئی شوق نہیں، کسی ہیروئن کے ساتھ کام کرنے کا اس لیئے میں اپنی ساری توجہ صرف اپنے کام پر دیتا ہوں، ہیروئنوں پر نہیں۔

س: کس شخصیت سے بہت متاثر ہیں آپ؟

ج: ویسے تو میں ہر کسی سے بے حد متاثر ہوں لیکن چونکہ آپ نے شخصیت کا پوچھا ہے تو ادب سے مجھے بہت لگاؤ ہے اسلیئے مجھے مرزا غالب، سادات حسین منٹو، اشفاق احمد اور سب سے بڑھ کر حضرت محمد ﷺ سے بہت متاثر ہوں، اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں آپ ﷺ کا امتی ہوں، مسلمان ہوں۔

س: آپ کو وزیر اعظم بنا دیا جائے تو پہلا کام کیا کریں گے؟

ج: ہائے میں جاواں، ہائے میں قربان جاواں۔

بے جے بن جاواں وزیر تے روز ہی جاپان جاواں

ایسا ممکن نہیں ہو سکتا، لیکن اگر مجھے موقع ملا تو میں تعلیم مفت کرونگا اور عام کروں گا علاج مفت کروں گا اور غریبوں کو گھر فری دونگا، بن اگلی واری ووٹ میچوں ہی پایا۔

س: پاکستانی عوام کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

ج: ارشاد باری تعالیٰ ہے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو تفرقے میں نہ پڑو۔
ساری قوم کو متحد ہو کر ایک قوم کی حیثیت سے مل جل کر رہنا چاہئے اور حضرت محمدؐ کی پیروی کرنی چاہیے۔

نمائندہ: جی آپ کا بہت شکریہ آپ نے ہمارے لیے وقت نکالا

جانو بابا: جی شکریہ کی کوئی ایسی بات نہیں۔

☆-----☆-----☆

پانچ چیزوں کے جوابات

حضرت شفیق بن ابراہیمؒ فرماتے ہیں کہ میں نے پانچ چیزوں کے متعلق سوال کیا تمام نے ایک ہی جواب دیا۔

1۔ میں نے پوچھا۔ "عاقل کون ہے؟" سب نے یہی جواب دیا کہ "عاقل وہ شخص ہے جو دنیا سے محبت نہیں کرتا۔"

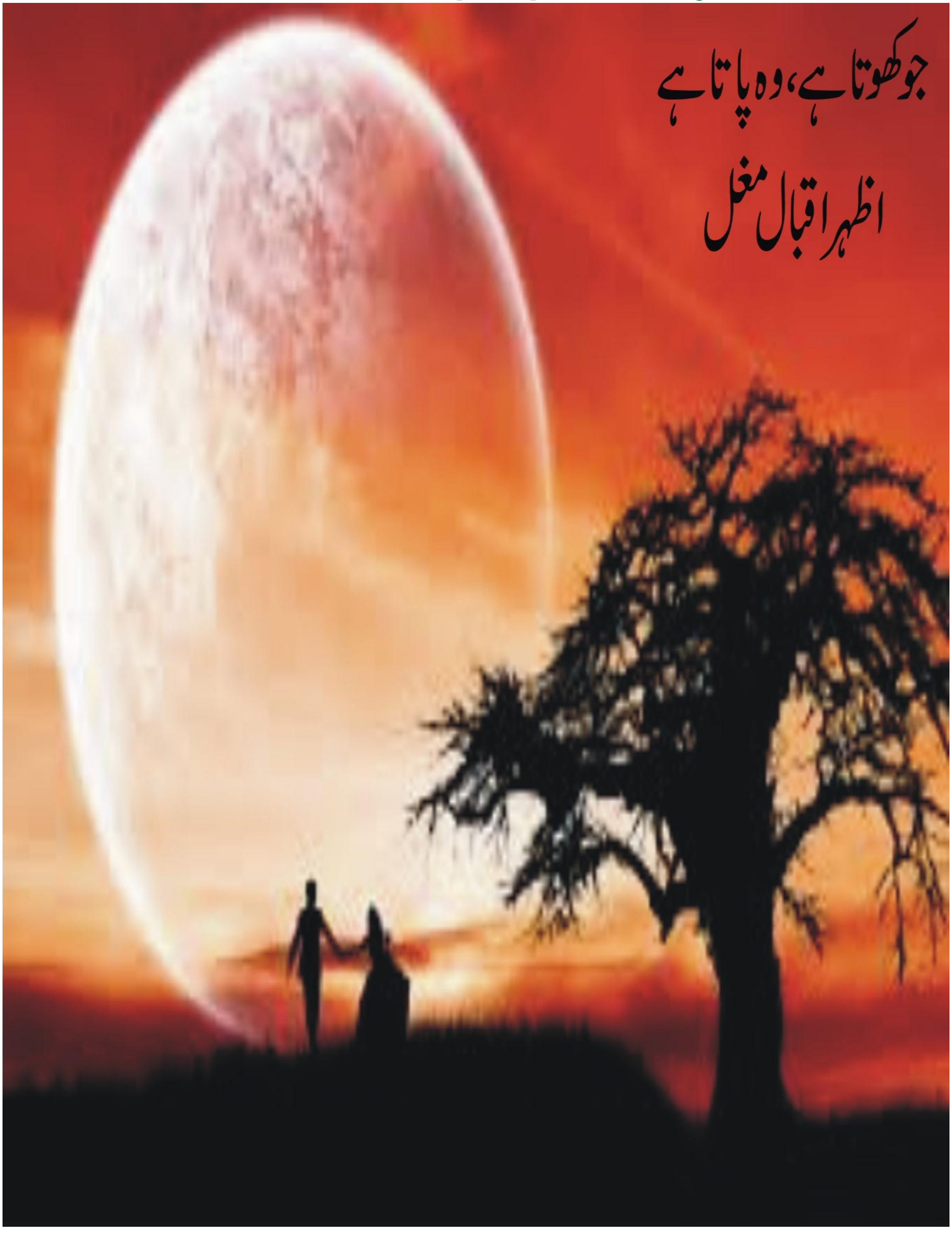
2۔ میں نے پوچھا "دانا اور ہوشیار شخص کون ہے۔" جواب ملا۔ "جسے دنیا دھوکہ نہ دے سکے۔"

3۔ میں نے پوچھا۔ "غنی کون ہے؟" جواب آیا۔ "جو اپنے لئے اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی ہو جائے۔"

4۔ میں نے پوچھا۔ "فقیر کون ہے؟" جواب ملا۔ "جو زیادہ کی طلب نہیں رکھتا۔"

5۔ میں نے پوچھا۔ "بخیل کون ہے؟" جواب ملا۔ "جو شخص اپنے مال میں سے اللہ پاک کا حق ادا نہیں کرتا۔"

(انتخاب: ناصر احمد۔ کراچی)


جو کھوتا ہے، وہ پاتا ہے
اظہر اقبال مغل

جو کھوتا ہے، وہ پاتا ہے۔

تحریر: اظہر اقبال مُغل

دنیا میں بہت سارے ایسے لوگ ہیں جو کہ اپنی ناکامی کا شکوہ کرتے ہیں کہ اُن کی زندگی میں ناکامیاں ہی ناکامیاں ہے آج تک انھوں نے کبھی کامیابی کا منہ تک نہیں دیکھا، شائد وہ زندگی میں کامیاب ہو نہیں سکتے ،ایسا نہیں ہوتا کہ وہ لوگ کامیاب نہیں ہو سکتے ان کی ناکامی کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے جس کا ان لوگوں کو علم نہیں ہوتا، اس لیئے وہ مسلسل ناکامیوں کا شکار ہو رہے ہوتے ہیں، اس دنیا کا ایک سنہری اصول ہے، جس کو اپنا کر کوئی بھی انسان ترقی کر سکتا ہے ۔اس کے بغیر ترقی کرنا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔

اگر انسان صرف اس ایک اصول کو اپنی زندگی میں شامل کر لے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے ،وہ اصول ہے جو کھتا ہے وہ پاتا ہے جس انسان نے بھی اس اصول کو اپنا لیا وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں کامیاب ترین انسان ہے ۔اس کا مطلب کیا ہے کہ جو کھتا ہے وہ پاتا ہے اس کا مطلب ہے جو انسان محنت کرتا ہے کسی بھی کام کو وقت دیتا ہے کامیابی یقینی ہوتی ہے، لیکن آج ہم کوئی آسان راستہ ڈھونڈتے ہیں جب ناکامی ہوتی ہے تو شکوہ کرتے ہیں قصوروار قسمت کو ٹھہراتے ہیں، حالانکہ کہ ایسا نہیں ہوتا کہیں نہ کہیں ہم کوئی ایسی غلطی کر رہے ہوتے ہیں جو کہ انسان کی ناکامی کا سبب بنتی ہے، ورنہ کوئی ایسی وجہ نہیں ہے کہ انسان محنت کرے اور اسے اس کا پھل نہ ملے۔

کسی کی بھی محنت رائیگاں نہیں جاتی محنت ضرور رنگ لاتی ہے ۔لیکن محنت کے بعد پھل کے لیئے تھوڑا انتظار کرنا پڑتا ہے ۔جیسے انسان کوئی درخت لگاتا ہے تو وہ فوری پھل نہیں دیتا ،اس سے پھل حاصل کرنے کیلئے محنت اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے، جو صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا وہ کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے لیکن جو جلدی کرتا ہے اسے ناکامی ہوتی ہے کوئی بھی کام ہے اس کا نام ہوتا ہے فوری طور پر کامیابی کسی کام میں حاصل نہیں ہوتی ، ہمیشہ جلد باز لوگ ہی ناکام ہوتے ہیں وہ جلدی جلدی ترقی کرنے کے چکر میں ساری زندگی برباد کر لیتے ہیں لیکن ترقی نہیں کر پاتے ترقی کرنے کیلئے مستقل مزاج ہونا بہت ضروری ہے، جو انسان مستقل مزاج نہیں ترقی کرنا اس کے لیئے مشکل ہے ۔ایسا انسان نہ کھتا ہے ضرور ہے لیکن پاتا نہیں۔

جب کوئی فصل بوئی جاتی ہے تو اس کے پکنے کا انتظار ضرور کیا جاتا ہے اگر فصل کو پکنے سے پہلے ہی کاٹ لیا جائے تو اس سے کیا فائدہ ہوگا الٹا نقصان ہوگا، ساری محنت رائیگاں جائے گی، اس لیئے کھونے کے بعد کچھ پانے کچھ حاصل کرنے کا انتظار کیا جائے ، کیونکہ کہ کوئی بھی انسان کوئی بھی کام آہستہ آہستہ سر انجام دیتا ہے ایک دم کچھ نہیں کر سکتا، جس کی سب سے بڑی مثال انسان خود ہے کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو بچہ ہوتا ہے آہستہ آہستہ بڑا ہوتا ہے اور ترقی کی منازل طے کرتا ہوا جاتا ہے یہی حساب انسان کی زندگی کا ہے کوئی بھی کام ہے پہلے آغاز کیا جاتا ہے تب ہی وہ کام انجام کو پہنچتا ہے۔

موجودہ دور سائنس و ٹیکنالوجی کا دور ہے ۔آج دُنیا میں

جتنی بھی ترقی ہوتی ہے یکدم نہیں ہوتی آہستہ آہستہ ہوتی ہے اور ہو رہی ہے۔ ہر کام کے لیئے وقت درکار ہوتا ہے جس کام کو آپ جتنا وقت دیتے ہو اس کام سے آپ کو اتنا ہی فائدہ ملتا ہے۔ ایک طالب علم اپنی پڑھائی پر جتنی زیادہ توجہ دیتا ہے اس کو اس کا اتنا ہی صلہ ملتا ہے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اگر آپ نے کسی کام میں ٹائم ضائع کیا ہو تو آپ کو اس کا صلہ نہ ملا ہو انسان جتنا کھوتا ہے اتنا ہی پاتا ہے۔ محنت کی کوئی حد نہیں، انسان جتنی محنت کرے گا اسے اسی حساب سے پھل ملے گا۔ بعض اوقات ہمیں نظر آتا ہے کہ ایک انسان کچھ بھی نہیں کر رہا اور کامیاب انسان ہے اگر اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا جائے تو کوئی لمحہ اس کی زندگی کا ضرور ہوگا جس میں اس نے محنت کی ہوگی لیکن اس کا پھل اب اسے مل رہا ہوگا، جب وہ کچھ کرتا دکھائی نہیں دے رہا۔

جو ہمیں نظر آتا ہے اس کے پیچھے کتنی محنت ہوتی ہے ایک عام انسان نہیں جانتا۔ کیوں کہ ایک سوئی سے لیکر جہاز بنانے تک میں محنت درکار ہوتی ہے۔ اس لیئے دنیا میں وہی انسان کامیاب ہے جو محنت کرتا ہے، جو محنت نہیں کرتا وہ ایک ناکام انسان ہے بزدل انسان ہے کیوں کہ کامیاب انسان کی کامیابی کا راز ہی محنت ہوتی ہے۔ محنت کے بغیر کامیابی مشکل ہے، اس لیئے اس دنیا کا اصول ہے جو کھوتا ہے وہ پاتا ہے۔ جو کھوتا نہیں وہ نہیں پاتا اس سنہری اصول کو اگر اپنا لیا جائے تو انسان کی ترقی یقینی ہے۔ جو انسان مسلسل ناکامیوں کا شکار ہو رہا ہے وہ اپنی زندگی کا بغور جائزہ لے کر وہ اپنی زندگی میں کیا غلطی کر رہا ہے، جس کی وجہ سے اسے ناکامی ہو رہی ہے۔ اگر انسان اس غلطی اس کمزوری کو دور کرلے جو اس کی ناکامی کی وجہ بن رہی ہے تو وہ دن دور نہیں جب کامیابی اس کے قدم چومے گی۔ اس کے برعکس انسان صرف ناکامی کا شکوہ کرے محنت نہ کرے اپنی غلطیوں سے کچھ سبق حاصل نہ کرے بلکہ سارا الزام قسمت کو دے کہ قسمت ہی خراب ہے، تو اس انسان کا تب تک کچھ نہیں ہو سکتا، جب تک وہ اپنی ذات پر غور و فکر کر کے اپنی کمزوریوں اور اپنی غلطیوں کو دور نہیں کر لیتا، کیونکہ انسان غلطیوں سے بہت کچھ سیکھتا ہے، جب تک کچھ غلط نہیں ہوگا ٹھیک کا پتہ کیسے چلے گا۔ اس لیئے غلطی ہونا کوئی بڑی بات نہیں غلطی کو تسلیم کرنا اپنی غلطیوں کو دور کرنا بہت بڑی بات ہے جو انسان اپنی کمزوریوں اپنی غلطیوں کو دور کرلیتا ہے اس ترقی کامیابی دور نہیں ہوتی۔

رحمت کی برسات

رحمت کی برستی رہیں امطار مسلسل
رمضان میں میرے مولیٰ ترے انوار مسلسل
آمد کی خبر سنتے ہی سب ہوگئے ہیں خوش
مصروف ہوئے ذکر میں ابرار مسلسل
اس کے لیے رب نے بڑے انعام رکھے ہیں۔
بھوکا رہے جو دن میں وفادار مسلسل
اس ماہ مقدس ہی میں قرآن ملا ہے۔
کھولے گئے اس ماہ میں اسرار مسلسل
اللہ کے بندے سبھی اب روزے رکھیں گے۔
شیطان ہوا قید میں بیزار مسلسل
انعام الٰہی ہے حیاؔ ہر مسلمان
ملتا ہے جو ہر پل پہ ثمبار مسلسل

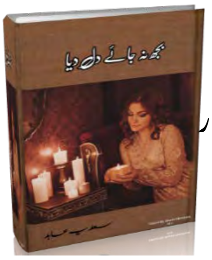
حیا خان۔ لاہور

عہدِ وفا



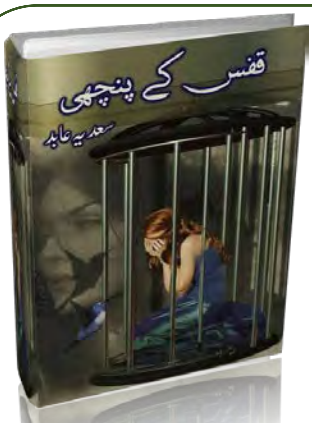
ایمان پریشے کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا مُنفرد ناول، مُحبت کی داستان جو معاشرے کے رواجوں تلے دب گئی، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

بُجھ نہ جائے دِل دیا



سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، مُحبت، نفرت، عداوت کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

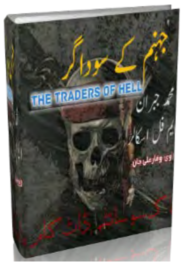
قفس کے پنچھی



سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے جلد، **کتابی شکل** میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔

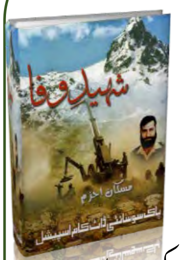
آن لائن پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

جہنم کے سوداگر



مُحمد جبران (ایم فِل) کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ایکشن ناول، پاکستان کی پہچان، دُنیا کی نمبر 1 ایجنسی آئی ایس آئی کے اسپیشل کمانڈو کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

شہیدِ وفا



مُسکان احزم کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ناول، پاک فوج سے مُحبت کی داستان، دہشت گردوں کی بُزدلانہ کاروائیاں، آرمی کے شب و روز کی داستان پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

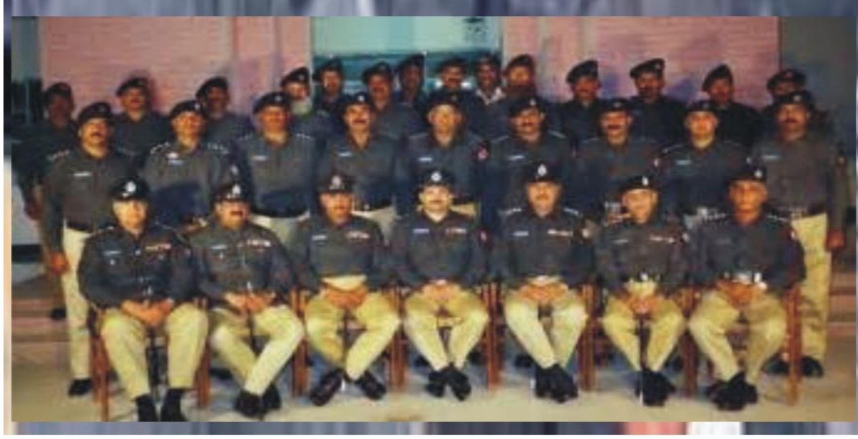
آپ بھی لکھئے:

کیا آپ رائٹر ہیں؟؟؟۔ آپ اپنی تحاریر پاک سوسائٹی ویب سائٹ پر پبلش کروانا چاہتے ہیں؟؟؟

اگر آپکی تحریر ہمارے معیار پر پُورا اُتری تو ہم اُسکو عوام تک پہنچائیں گے۔ **مزید تفصیل کے لئے یہاں کلک کریں۔**

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام، **پاکستان کی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی کتابوں کی ویب سائٹ، پاکستان کی ٹاپ 800 ویب سائٹس** میں شُمار ہوتی ہے۔





PUNJAB POLICE
PAKISTAN

پاکستانی پولیس

تحریر: اظہر اقبال مغل

پاکستانی پولیس کا نام جب بھی آتا ہے پاکستانی عوام کا رد عمل ٹھیک نہیں ہوتا اس کی آخر کیا وجہ ہے آخر ہیں تو پولیس والے بھی انسان ہی ان سے عوام کی اتنی نفرت کیوں ،حالانکہ کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں کرپشن نہ ہو لیکن بدنام پولیس ہے ،آخر اس کی اصل وجہ کیا ہے کہ لوگ پولیس سے اتنے بدظن کیوں ہیں ،اور بدظن ہونے کے باوجود نفرت ہونے کے باوجود کوئی بھی مسئلہ ہو لوگ پولیس کے پاس جاتے ہیں ،کیوں وہ اس لیئے کہ عوام کو پتہ ہے پولیس ہماری حفاظت کیلئے ہے ہماری محافظ ہے پولیس اس لیئے اگر کوئی بھی بات ہوتی ہے تو پولیس کو ہی بلایا جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دراصل خرابی پولیس میں نہیں ہے خرابی اس سسٹم ہے جو کہ پاکستان میں چل رہا ہے۔جب تک یہ سسٹم ٹھیک نہیں ہوگا کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا ۔اس لیئے اگر کچھ ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے تو اس سسٹم کو ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے پولیس خود بخود ٹھیک ہو جائے گی ۔اگر ایک پولیس مین کی زندگی پر ایک نظر ڈورائی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ایک پولیس والے کے ساتھ کیا کیا مسائل درپیش ہیں۔جو کہ شائد ایک پولیس والا ہی بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔

عام انسان کو کو تو پولیس والے میں شائد بہت خامیاں نظر آئیں ،لیکن بعض اوقات جو نظر آتا ہے حقیقت وہ نہیں ہوتی حقیقت کچھ اور ہوتی ہے ۔ایک پولیس مین کی ڈیوٹی کتنی سخت ہوتی ہے یہ وہی جانتا ہے ۔ایک عام آدمی کو اس کا اندازہ نہیں ہے کہ ایک پولیس مین کو کتنی ڈیوٹی دینی پڑتی ہے۔جب وہ تھکا ہارا گھر آتا ہے تو اس کے بچے اور بیوی بھی اس کو آرام نہیں کرنے دیتے ،راتوں کو جاگ کر ڈیوٹی کرنے والے پولیس مین کو جب آرام کا موقع نہیں ملیگا تو اس میں کس قدر روڈ پن تناؤ یا ذہنی انتشار پیدا ہو جائے گا ،یہ شائد کوئی ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے۔

پھر ایک پولیس مین کا واسطہ سارا دن مختلف لوگوں سے پڑتا ہے ،جن میں زیادہ تر کریمنل لوگ ہوتے ہیں ۔جن سے زیادہ تر سے ڈائریکٹ ڈیل کرنی پڑتی ہے ،جو کہ ایک پولیس والے کی شائد مجبوری بن چکی ہے ۔اس لیئے ایک پولیس مین کا عام زندگی میں بھی لہجہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسے کہ مجرموں کے ساتھ ہوتا ہے۔کیوں کہ ایک پولیس مین کی عادت بن جاتی ہے ،جسے وہ خود ہی بدل سکتا ہے اسلیئے ایک عام آدمی کے ساتھ بھی پولیس کا رویہ وہی ہوتا ہے جو کہ ایک مجرم کے ساتھ ہوتا ہے ۔بس ادھر سے ہی بگاڑ پیدا ہوتا ہے ،جس نے جرم نہیں کیا ہوتا اس کے ساتھ بھی مجرم جیسا سلوک پولیس سے نفرت کا باعث بنتا ہے ،اب پولیس کو تو پتہ نہیں کون قصوروار ہے کون بے گناہ اس لیئے جب تفتیش کے دوران ایک بے گناہ انسان کی عزت جب مجروح ہوتی ہے تو وہ پولیس کو اچھا نہیں سمجھتا۔

حالانکہ ایسا نہیں ہے ،اچھے بُرے لوگ ہر شعبہ میں ہیں اصل میں پولیس کا کام جرم کو روکنا ہوتا ہے قانون بنانے کا مقصد یہ نہیں کہ لوگوں میں خوف و ہراس پھیلایا جائے ،قانون بنانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی جان و مال کا تحفظ فراہم کیا جائے جو لوگ اس معاشرہ میں میں بگاڑ کی وجہ بن

رہے ہیں جن لوگوں کی وجہ سے اس معاشرہ کا امن امان متاثر ہو رہا ہے ایسے لوگوں سے اس معاشرہ کو پاک کیا جائے تا کہ جرم کی روک تھام ہو سکے ہو معاشرہ سکون کی نیند سو سکے۔ جس کیلئے پولیس کو تعینات کیا جاتا ہے اور پاکستانی پولیس اپنی جان پر کھیل کر یہ کام سرانجام دے رہی ہے معاشرہ میں امن امان قائم رکھنے اور عوام کو تحفظ فراہم کرنے کیلئے پولیس دن رات کوشاں ہے۔ آج اس معاشرہ میں جو جو امن امان نظر آتا ہے یہ پولیس ہی کی بدولت ہے آج اگر پولیس اپنا کام کرنا چھوڑ دے تو معاشرہ میں بہت بگاڑ اور انتشار پیدا ہو گا کوئی بھی سکون کی نیند نہیں سو سکے گا۔

کتنے لوگوں کو سزائیں ملتی ہیں اس کے باوجود جرم پر قابو نہیں پایا جا سکا اگر بالکل سزا نہ ہو تو کیا ہو گا، جرم کی شرح کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔ آج کتنے ہی پولیس کے نوجوان ہیں جنہوں نے عوام کی حفاظت کرتے کرتے اپنی جانوں تک کے نذرانے پیش کر دیئے۔ حکومت نے ان کے لواحقین کو کافی پیسوں سے نوازا ان کی مدد کی، لیکن کیا دولت ایک شوہر، ایک باپ ایک بھائی یا ایک بیٹے کی کمی کو پورا کر سکتی ہے۔ جس گھر میں آگ لگتی ہے اسے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ آگ کیا ہے، پولیس میں بہت سی کالی بھیڑیں بھی ہوں گی لیکن وہ سب سسٹم کی پیداوار ہے صرف چند کالی بھیڑوں کی وجہ سے پولیس کی کارکردگی پر پانی پھیرنا کہاں کا انصاف ہے، پولیس کیلئے عوام کے دلوں میں جو نفرت ہے اس دلوں سے نکالنا ہو گا۔

اور پولیس کو بھی عوام کے دل جیتنے ہوں گے اپنے اچھے اخلاق سے اور اس سسٹم کو بھی بدلنے کی بہت اشد ضرورت ہے جس کی وجہ سے اس طرح کے حالات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو عوام کی نفرت زور پکڑتی دکھائی دیتی ہے اس میں حکمتِ عملی اپنانے کی ضرورت ہے تا کہ پولیس اور عوام کے تعلقات میں بہتری آسکے اور پولیس اور عوام مل کر جرائم کی روک تھام کر سکیں، یہ سب کرنے کیلئے سسٹم میں تبدیلی بہت ضروری اقدام ہے تا کہ پولیس اور عوام مل کر اس وطن پاکستان کو جرم اور دہشت گردی جیسی لعنت کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کر سکیں۔

بہت سے لوگ صرف اسی وجہ سے پولیس کا ساتھ نہیں دیتے کیوں کی ان کے دلوں میں پولیس کا خوف ہوتا ہے کہ کہیں میں ہی کسی جھوٹے مقدمے میں نہ پھنس جاؤں، بہت سے لوگ صرف اس وجہ سے پولیس کی مدد نہیں کرنا چاہتے جس سے جرم کو تقویت ملتی ہے اور جرم خوب پھلتا پھولتا ہے جب تک پولیس کے علم میں یہ بات آتی ہے جرم کافی پھیل چکا ہوتا ہے اگر بروقت اس جرم پر قابو پایا جاتا اسے روکنا آسان ہوتا یہ تب ہی ہو گا جب پولیس اور عوام مل کر کسی جرم کو روکنے کی کوشش کریں گے۔ اس عوام کا فرض بنتا ہے کہ کوئی بھی جرم ہوتا دیکھیں تو بروقت پولیس کو آگاہ کر دے تا کہ پاکستان کو امن کا گہوارہ بنایا جا سکے۔

سنہری اقوال

☆ کسی کو غم دینے میں آپ کو خوشی مل سکتی ہے لیکن کسی کو خوشی دینے میں غم نہیں ملتا۔

☆ اگر زندگی کو ہمیشہ خوشیوں کے سہارے گزارنا چاہتے ہو تو غم زدہ لوگوں کے غم بانٹا کرو۔ کبھی دکھی نہیں ہو گے۔

☆ کبھی امیدوں سے دست بردار نہ ہوں کیونکہ وہ تمہارے پاس موجود نعمتوں کو حقیقت بنا دیتی ہیں۔

☆ جس شخص میں تنقید سہنے کی ہمت نہیں ہوتی سب سے زیادہ تنقید اسی پر کی جاتی ہے۔

(چوہدری کامران۔ مغل)

انفاق فی سبیل اللہ

تحریر: نازیہ کیانی

دنیا اور اسباب دنیا کی محبت کے سبب سے اللہ تعالیٰ سے جو غفلت پیدا ہوتی ہے اس کا سب سے زیادہ موثر اور کارگر علاج اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا ہے۔ یہ مال زکوۃ کے علاوہ ہے۔

جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی اللہ کا حق ہے" (ترمذی)

انسان کو چاہیے کہ اپنی اولاد اپنے کنبے کی حال اور مستقبل کی نا گزیر ضروریات کے سوا ہر کام سے اپنا مال بچا کر اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی کوشش کرے۔ انسان کا دل اگر مال کی محبت، بخیلی اور کنجوسی کی بیماری سے پاک ہو جائے تو اس کے لیے تمام نیکیوں کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "تو جس نے اللہ کی راہ میں مال دیا اور (اللہ کی نافرمانی سے) پرہیز کیا اور نیک بات کو سچ جانا اس کو ہم آسان راستے کی توفیق دیں گے۔ اور جس نے بخل کیا اور (خدا سے) بے نیازی برتی اور نیک بات کو جھوٹ سمجھا اس کو ہم تنگی کی راہ پر ڈال دیں گے اور جب وہ دوزخ کے گڑھے میں گرے گا تو اس کا مال اس کے کچھ کام نہ آئے گا" (اللیل)۔

مال جمع کرنے کی خواہش عموماً مستقبل کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے، لیکن انسان مستقبل کو اسی زندگی تک محدود سمجھتا ہے اصل مستقبل یعنی آخرت کو نہیں دیکھتا حالانکہ اس کے مال کا اصل فائدہ صرف تبھی اس کو حاصل ہو سکتا ہے جب وہ اس کو دنیا کے بینکوں میں جمع کروانے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے بنک میں جمع کروائے تاکہ وہ اس کو آخروی اور نہ ختم ہونے والی زندگی میں کام آئے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

"تم میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کا رب اس طرح کلام فرمائے گا کہ اس کے اور اس کے رب کے درمیان کوئی ترجمان نہ ہوگا۔ پھر وہ اپنے دائیں بائیں دیکھے گا اسے صرف اپنے وہ اعمال نظر آئیں گے جو اس نے پہلے آگے بھیجے ہوں گے۔ اور وہ اپنے آگے دیکھے گا تو اسے اپنے چہرے کے سامنے صرف دوزخ نظر آئے گی۔ پس اے لوگو! دوزخ سے بچو چاہے کھجور کا ایک ٹکڑے (کو خیرات کرنے) کے عوض ہی کیوں نہ ہو۔" (بخاری)

خیرات کرنا خدا کے غضب کو بجھاتا ہے اور بری موت کو دور کرتا ہے۔ (ترمذی)

انفاق فی سبیل اللہ مال میں باعث برکت ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اس طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے، بڑھاتا ہے۔ اور وہ بڑی کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے (البقرہ)۔

انفاق کرنے والے کے لئے مال سے فائدہ اٹھانے والے تمام لوگ بلکہ فرشتے بھی دعا کرتے ہیں۔ ہر روز صبح دو فرشتے اترتے ہیں ایک دعا کرتا ہے کہ اے اللہ تو اپنی راہ میں مال خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عطا فرما دوسرا فرشتہ کہتا ہے کہ تو مال

روک کر رکھنے والے کا مال برباد کر۔ (بخاری)

برکت کے معنی یہ نہیں کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کی تجوریاں بھر جاتی ہیں اور وہ انتہائی دولت مند اور صاحب جائیداد ہو جاتا ہے۔ بلکہ برکت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے مال کا حقیقی فائدہ اور نفع جس مقدار میں حاصل کرتا ہے وہ دوسرے حاصل نہیں کر پاتے۔ جو سکون قلب اللہ پر اعتماد قلبی مسرت اور دل روح کی بادشاہی اس آدمی کو حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کو کبھی خواب میں بھی وہ چیز نظر نہیں آتی جو مسلمان کسی مسلمان کو ننگے پن کی حالت میں کپڑا پہنائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جنت کا لباس پہنائے گا۔ جو مسلمان کسی مسلمان کو بھوک کی حالت میں کھانا کھلائے گا اللہ تعالیٰ اس کو جنت سے پھل کھلائے گا اور جو مسلمان کسی مسلمان کو پیاس کی حالت میں پانی پلائے گا اللہ تعالیٰ اس کو ایسی شراب جنت پلائے گا جس پہ مہر لگی ہوگی۔ (ترمذی)

جس کسی نے پاک کمائی میں سے ایک کھجور برابر بھی خیرات کی اللہ اسے اپنے دائیں ہاتھ میں قبول فرماتا ہے اور اللہ تو پاک چیز ہی قبول کرتا ہے۔ پھر وہ اس خیرات کرنے والے کے لئے پالتا رہتا ہے۔ جیسے تم میں سے کوئی اپنے بچھیرے کو پالتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خیرات پہاڑ کے برابر ہو جاتی ہے۔ (بخاری)۔ راہ خدا میں خوب خرچ کیا کرو اور گن گن کر نہ دو اور اگر ایسا کیا تو اللہ بھی تجھے گن گن کر دے گا۔ اور مال محفوظ کر کے نہ رکھو اور اگر ایسا کیا تو اللہ بھی تجھ پر محفوظ کر رکھے گا۔ خدا کی راہ میں عطا کرو جتنا بھی تجھ سے ہو سکے۔ (بخاری) ایک مرتبہ آپ کے ہاں ایک بکری ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا گیا آپ گھر تشریف لائے تو پوچھا بکری میں سے کیا باقی رہا؟ جواب ملا ایک شانے کے سوا کچھ باقی نہ رہا آپ نے فرمایا ایک شانے کے سوا ساری بکری بچ گئی (ترمذی)

آپ کی مراد یہ تھی کہ جو کچھ راہ خدا میں خرچ ہو وہ حقیقت وہ بچ گیا۔ جو کچھ ہمارے پاس رہتا ہے کیا عجب ہے کہ اس نے کبھی بھی ہمارے کام نہ آنا ہو۔ اور ہم بے کار میں اسے سنبھال سنبھال کر رکھنے میں اپنی قوت اور وقت دونوں ضائع کرتے ہیں۔ سائلوں سے سلوک۔ آدمی جس سائل اور محتاج کو بھی دیکھے اس سے یہ سبق سیکھنے کی کوشش کرے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس کی بھی اس سائل کی حیثیت میں پیدا کر سکتا تھا اور اگر چاہے تو اب بھی اس کی صف میں اس کو کھڑا کر سکتا ہے۔ سائلوں سے سلوک کے ضمن میں قرآن مجید کی یہ آیت یاد رکھنی چاہیئے سائل کو مت جھڑکو۔ (الضحیٰ)

زندگی

زندگی ایک حقیقت ہے فسانوں جیسی
اس کے کردار عجب
اس کے حوالے بھی عجب
ایک ہی رات ستاروں سے بھری
اور اسی رات کے اک گوشے میں
کتنے سپنے ہیں کسی درد سے بوجھل بوجھل
کتنی آنکھیں کسی خواب کی خوشبو سے تہی
اس کی تاریکی عجب، اس کے اجالے بھی عجب
ہے یہ منظر بھی عجب
دیکھنے والے بھی عجب

(انتخاب۔ ملک اللہ بخش اسلم۔ سلانوالی، سرگودہا)


راہِ محبت میں......
ملک این اے کاوش

راہ محبت میں...... (دوسری قسط)

تحریر: ملک این اے کاوش اعوان......سلانوالی ،سرگودھا

ملک ذیشان جیسے آزاد خیال انسان کی اہلیہ بننے کے بعد اس کی پریشانی کافور ہوگئی تھی۔ملک ذیشاب بحث ومباحثہ کرنے والا انسان نہیں تھا۔دور حاضر کو سمجھنے والا اور احساس مند انسان تھا۔جب فریحہ ذیشان نے اس کے سامنے اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کیا تو ملک ذیشان نے خوشی سے مخمور ہوکر کہا کہ:

"میں سمجھتا ہوں کہ میں نے بھلے وقت میں ایک بھلا فیصلہ کرکے تمہیں اپنا جیون ساتھی بنایا تھا۔میری خواہش تھی کہ میری اہلیہ ایک ایسی عورت ہو جس کے اندر خود غرضی اور انا پرستی کا مادہ نہ ہو نہ ہی اس کی سوچوں کی حد اس تک محدود ہو بلکہ میری ہونے والی اولاد کے روشن مستقبل کی خواہاں ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ میں اس خالق کل جہان کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔"

"میں آپ کی مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اتنی پذیرائی دی۔"فریحہ نے خوشی سے باغ باغ ہوکر جواب دیا۔

"ایک سلجھی ہوئی پڑھی لکھی عورت اپنے بچوں کا بہتر مستقبل بنا سکتی ہے۔"ملک ذیشان بولے۔

"خاوند بے شک پی ایچ ڈی پاس ہو لیکن عورت ان پڑھ ہو تو اولاد کی پرورش ویسی نہیں ہو سکتی جیسی ایک پڑھی لکھی عورت کرتی ہے۔پڑھی لکھی عورت کے اندر شعور ہوتا ہے جبکہ ان پڑھ عورت ایک حد تک محدود ہوتی ہے۔اس کا علم سنا سنایا ہوتا ہے۔پرورش ان پڑھ عورت بھی کر سکتی ہے لیکن اس کے باوجود پڑھی لکھی عورت اپنے بچوں کی پرورش اس سے کم از کم کچھ درجے بہتر کر سکتی ہے۔تمہاری بات سے میں بے حد خوش ہوا ہوں۔مجھے یقین ہے کہ میری اولاد کا مستقبل روشن ہوگا۔"

"ماشاءاللہ۔"فریحہ نے خوشی سے لبریز لہجے میں کہا۔

ملک ذیشان کے اس جواب سے فریحہ کی نہ صرف ڈھارس بندھی تھی بلکہ اس کے ارادے اور حوصلے بھی مزید پختہ ہوگئے تھے۔فریحہ ذیشان کے گھر یکے بعد دیگرے چار بیٹوں اور ایک بیٹی نے جنم لیا۔سب سے بڑے بیٹے کا نام عاطف اور اس سے چھوٹے کا نام نعمان رکھا گیا تھا۔

نعمان سے چھوٹا یوسف تھا اور سب سے چھوٹا ریحان تھا اور سب سے آخر میں ملائکہ تھی۔فریحہ ذیشان اپنی دختر سے والہانہ محبت کرتی تھی۔ملک ذیشان بھی اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتے تھے۔یہی نہیں ملائکہ اپنے بھائیوں کی آنکھوں کا تارا تھی۔

عاطف نے جیسے ہی ایم کام مکمل کیا۔ملک ذیشان نے اسے کینیڈا بھیج دیا تھا۔عاطف کو وہاں اچھی جاب مل گئی۔جس کی وجہ سے ملک ذیشان کے گھریلو حالات پہلے سے مزید بہتر ہونے لگے تھے۔نعمان نے بی ایس جیسے ہی مکمل کیا عاطف نے اسے بھی کینیڈا بلوا لیا۔

محمد یوسف شروع سے ہی پڑھائی سے کنی کتراتا تھا۔اتفاق سے بھائیوں میں وہ اپنے والدین کو کچھ زیادہ ہی پیارا تھا۔دونوں میاں بیوی نے بہت چاہا کہ وہ پڑھ لکھ

جائے اور اپنے بھائیوں کے جیسے محنتی ثابت ہو لیکن مجال ہے اس کے کانوں پر جوں تک رینگ جاتی۔ بڑی مشکل سے اس نے میٹرک پاس کی اور میٹرک کے بعد تعلیم کو خیرآباد کہہ دیا۔ وہ شروع سے ہی کوئی کام کرنا چاہتا تھا۔ اسی وجہ سے تعلیم کو خیرآباد کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنا گارمنٹس کا کام شروع کر دیا۔ اپنے کام کے ساتھ وہ مخلص تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا کام جلد ہی اچھا چل پڑا۔

یوسف نے کرائے کی ایک دکان میں کام شروع کیا تھا لیکن جلد ہی بھائیوں کی معاونت سے اس نے شہر کے وسط میں اپنی دکان خرید کر اس میں سارا سیٹ اپ تیار کیا۔ دوکان کا اس نے نہ صرف بیس منٹ بھی بنایا۔ بلکہ گراؤنڈ فلور کے اوپر فرسٹ فلور بھی تیار کیا۔ گراؤنڈ فلور کو وہ بطور سٹور استعمال کرنا شروع کر دیا اور فرسٹ فلور پر اس کی دکان پر کام کرنے والے ورکر رات کو سوتے تھے۔ جن کے لیے اس نے اچھا انتظام بنایا تھا۔

ریحان نے بھی بی کام کے پیپر دیئے تو اچھا رزلٹ نکلا۔ وہ متواتر بضد تھا کہ اسے بھی کینیڈا بھیجا جائے لیکن دونوں میاں بیوی اس کی بات سے متفق نہ تھے۔ یہی نہیں اس کے بھائی بھی اس بات پر راضی نہ تھے کیونکہ اس طرح گھر میں اکیلا یوسف بچتا تھا لیکن مجال ہے کہ اس کے کانوں پر جوں تک رینگ جاتی۔ وہ متواتر بضد تھا کہ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ وہ کینیڈا میں جاب بھی کرے گا۔

ملائکہ کا میٹرک کا اچھا رزلٹ نکلا۔ اس نے ہائی فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔ اسے ایک قریبی پرائیویٹ کالج نے فری تعلیم اور ٹرانسپورٹ کی آفر کی۔ جسے فریحہ نے فوراً قبول کر لیا اور ملک ذیشان کو اس کے بارے میں بتایا کہ ان کی بچی کو قریبی کالج میں فری تعلیم اور ٹرانسپورٹ کی سہولت مل رہی ہے۔ اس بات پر ملک ذیشان کو بھی کوئی اوبجیکشن نہ تھا۔

ملائکہ کو ایف ایس سی میں داخلہ دلوایا گیا۔ یوں فریحہ ذیشان کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہونے لگی۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ جس مقصد کو وہ خود نہ پا سکی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی بچی کے ہر جائز ناجائز چاؤ چونچلے کو پورا کرے گی۔ اور اسے بہر صورت اعلیٰ تعلیم دلوائے گی تا کہ وہ مستقبل میں اپنے بچوں کا بہتر مستقبل بنا سکے۔

☆-----☆-----☆

انیلہ کالج جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ جب اس کی دادی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ دادی کو دیکھ کر انیلہ نے حیرت سے دادی کو گھورا۔ انیلہ کی دادی کسی خاص موقع پر ہی اس کے کمرے میں آیا کرتی تھی۔ انیلہ نے ذہن پر کافی زور دیا لیکن اسے کوئی خاص بات یاد نہ آئی۔ جس کی وجہ سے انیلہ نے مڑ کر دادی کو سوالیہ نگاہوں سے گھورا۔

”دادی آج خیریت تو ہے ناں.....؟“ انیلہ نے پوچھا۔

”جتنا مجھے یاد پڑتا ہے۔ آج تو کوئی عید وید ہے۔ نہ کسی کی طرف سے آج کوئی میرج یا برتھ ڈے کا انوی ٹیشن آیا ہے۔ نہ کسی کی قل خوانی یا چالیسواں ہے تو پھر آج کیا کوئی نئی اطلاع دینے آئی ہیں آپ؟“

انیلہ کا لہجہ شرارتی تھا۔ اس کی دادی اس کی بات پر ہنس دی تھی۔

”تم ساری زندگی نہیں بدلوگی۔“ دادی نے اس کا کان مروڑتے ہوئے کہا۔

"تو کیوں کی داوی آپ میرے کمرے میں بنا کسی کام کے یا کوئی خبر دیے کے تو آتی نہیں ہیں۔" انیلہ نے سر کھجاتے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر شرارتی لہجے میں کہا۔

"آج اچانک آپ کو دیکھ کر تھوڑی حیرت ہو رہی ہے۔"

"کیا کروں پتر زیادہ چلا نہیں جاتا۔" داوی نے وجہ بیان کی۔

"سانس دھونکنی کی طرح پھول جاتی ہے اور پھر آج کل کی ینگ جنریشن سے ڈر لگتا ہے کہ بار بار آنے پر اکتا کر کہیں اولڈ ہاؤس ہی نہ بھجوا دیں۔"

داوی کی بات نشتر کی طرح اس کے سینے میں پیوست ہو گئی تھی۔ انیلہ جانتی تھی کہ داوی دوراندیش عورت ہیں۔ وہ سب سے بہت محبت کرتی ہیں لیکن چاہنے کے باوجود بھی کوئی بھی داوی کو خاص وقت نہیں دے پاتا۔ بس اک وہی تھی جو دن میں کئی بار داوی کے کمرے میں پہنچ جاتی تھی۔ جبکہ داوی بمشکل بعد اس کے کمرے میں آتی تھی۔

"داوی ایسی باتیں نہ کیا کریں۔" انیلہ نے داوی کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا۔

"آپ میری جان ہیں۔ کوئی آپ کی طرف انگلی اٹھا کر تو دیکھے۔ اور رہی اولڈ ہاؤس کی بات تو وہاں جائیں آپ کے دشمن۔ اس گھر کی رونقیں آپ سے وابستہ ہیں۔ اگر آپ سیکنڈ کے لیے مجھے دکھائی نہ دیں تو پورا گھر سونا سونا سا لگنے لگتا ہے۔"

"پتر میں بھی تم لوگوں سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔" داوی نے ترحم آمیز لہجے میں کہا۔ ان کے لہجے سے ان کے اندر کا دردھیاں تھا۔ انیلہ کا دل پسیج کر مٹھی میں آ گیا تھا۔

"میں تم لوگوں کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی یہی وجہ ہے کہ میں کسی کے کام میں دخل اندازی نہیں کرتی..... کوئی کیا کر رہا ہے کیا نہیں کر رہا میں نے کبھی توجہ بھی نہیں دی..... آج کا دور بہت سخت دور ہے۔ ڈر لگتا ہے کہ کہیں مجھے بھی....."

انیلہ نے داوی کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ اس نے بغور دیکھا تو داوی کی شہد رنگ آنکھوں میں گوہر ہائے آبدار چمک رہے تھے۔

"اول تو یہ ممکن نہیں ہے۔" انیلہ نے ان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

"اور اللہ نہ کرے ایسا ممکن ہوا بھی تو آپ کی پوتی آپ کو اکیلے نہیں جانے دے گی بلکہ ساتھ جائے گی۔"

"اللہ نہ کرے۔" داوی نے اسے سینے سے چپکاتے ہوئے نم آلود لہجے میں کہا۔

"اچھا سن آج سنا ہے کچھ مہمان آ رہے ہیں اور تیری ماں صبح سے اکیلی کچن میں کام کر رہی ہے تو ایسا کر آج چھٹی کر کے ماں کا ہاتھ بٹا۔ وہ بے چاری تھک جائے گی۔"

داوی کے دل میں اپنی ماں کا پیار دیکھ کر انیلہ بہت خوش ہوئی اور بولی: "آپ بہت اچھی ہیں داوی۔ کاش سب کی داوی ایسی ہی ہو۔ پیاری سی..... پیار کرنے والی..... محبت کرنے والی..... سہیلیوں کی طرح باتیں کرنے اور سننے والی۔"

"اب بس کر زیادہ باتیں نہ کر۔" داوی نے اسے ٹوکا۔

"اوکم آن داوی۔" انیلہ چہک کر بولی۔

"شاید آپ کو معلوم نہیں کہ پہلے کافی چھٹیاں ہو چکی ہیں۔ اس طرح روز روز کی چھٹیوں سے کہیں کسی دن کالج سے

ہی نہ نکال دی جاؤں۔"

"ایک دن اور چھٹی کر لوگی تو نہیں نکالیں گے۔" ماوی نے یقین کے ساتھ کہا۔

"زیادہ بہانے نہ بنایا کرو۔ دیکھو تو تمہاری ماں صبح سے کام کر کے تھک چکی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کر سارا غصہ مجھ پہ ہی نہ جھاڑ دیں۔ اس لیے چپ چاپ جو کہا ہے وہ کرو۔"

"ماوی آپ بھی ناں۔" انیلہ نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

آج کالج میں کافی اہم لیکچرز تھے لیکن وہ انکار کر کے ماوی کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماوی اس کے پاس بڑے یقین کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے فوراً علیہ اور ماریہ کو میسج کر کے بتا دیا کہ اس کے گھر میں کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ آج کالج نہیں آ سکے گی۔ اس لیے اس کی چھٹی لے لینا۔

ماوی اس کے بعد اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جبکہ انیلہ ڈریس تبدیل کرنے واش روم میں گھس گئی تاکہ جلد از جلد ماں کا ہاتھ بٹا سکے۔

☆-----☆-----☆

عبداللہ اور اس کی فیملی چند دن رہنے کے لیے اسلام آباد تیار ہو گئے۔ اسلام آباد عبداللہ کی خالہ کا گھر تھا۔ انیلہ عبداللہ کی خالہ زاد کزن تھی۔ لیکن دونوں نے ایک دوسرے کو آج تک نہ دیکھا تھا۔ آج کئی سالوں کے بعد یک لخت ہی ان لوگوں کی تیاری ہوئی تھی۔

تیاریاں تیزی سے مکمل ہو گئیں اور جلد ہی وہ سب روانہ ہو گئے۔ انہوں نے نکلنے سے قبل انیلہ کی والدہ کو آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ پبلک ٹرانسپورٹ کی بجائے انہوں نے خود کی گاڑی میں آنا بہتر سمجھا۔ ویسے بھی لاہور سے اسلام آباد کیا سفر انجوائے کرنے والا سفر ہوتا ہے۔ پبلک ٹرانسپورٹ میں انسان انجوائے نہیں کر سکتا لیکن اپنی گاڑی ہو تو سفر کا مزہ ہی دوبالا ہو جاتا ہے۔

ڈرائیونگ سیٹ ملک شہریار اسلم (عبداللہ کا والد) نے سنبھال لی تھی جبکہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر اس کی اہلیہ ثمرہ براجمان تھی۔ عبداللہ اور اس کے تینوں بھائی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے۔ سنگل باڈی ہونے کی وجہ سے انہیں بیٹھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ بجے کے قریب وہ اسلام آباد پہنچے۔ مہمانوں کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ سب لوگ ان سے گرمجوشی کے ساتھ ملے۔

انیلہ اس وقت کچن میں سالن تیار کر رہی تھی۔ جب اسے مہمانوں کی آمد کا پتہ چلا۔ مہمان ٹی وی لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔

"ارے موورکھ تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو۔" انیلہ کی والدہ نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے اسے ڈانٹا۔

"جاؤ جا کر مہمانوں سے مل کر آؤ۔"

"اکٹھا ایک بار ہی کھانا بنا کے مل لوں گی۔" انیلہ نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"چھوڑو یہ سب کچھ اور جو کہا ہے پہلے وہ کرو۔" انیلہ کی ماں نے اب کی بار چند اں درشت لہجے میں کہا تو اس نے پہلے ناگواری کے عالم میں ماں کو دیکھا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی کچن سے باہر نکل گئی۔

انیلہ نے آسمانی رنگ کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔جس میں اس کا سفید مکھڑا چودھویں کے چاند کی مانند چمک رہا تھا۔ عین اس وقت جب وہ کچن سے باہر نکلی اتفاق سے عبداللہ کی نظر اس پر پڑ گئی۔انیلہ ڈوپٹہ سر پر ٹھیک سے سجاتی ہوئی انہی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

عبداللہ کی تو جیسے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔انیلہ کسی اپسرا سے کم نہ تھی۔عبداللہ کے وہم گمان میں نہ تھا کہ اس کی کوئی کزن اتنی خوبصورت بھی ہوگی۔جو پہلی نظر اس کے دل میں اتر جائے گی۔

انیلہ پہلے عبداللہ کے والدین سے ملی۔پھر سارے کزنوں سے ہاتھ ملا کر سلام لیا۔جب اس کا نرم و گداز ہاتھ عبداللہ کے ہاتھ میں گیا تو اس کا من چاہا کہ وہ اس ہاتھ کو ہمیشہ کے لیے تھام لے۔جب عبداللہ نے خود انیلہ کا ہاتھ نہ چھوڑا تو اس نے کھینچ لیا اور ایک بھرپور نگاہ عبداللہ پر ڈالی۔

عبداللہ تو جیسے اسے پہلی نظر دیکھتے ساتھ ہی اس کا گرویدہ ہوگیا تھا۔وہ یک ٹک ٹکٹکی باندھے اسی کو تک رہا تھا۔عبداللہ کے اس طرح ٹکٹکی باندھے دیکھنے پر انیلہ نے پہلے تو غصے سے اسے دیکھا اور پھر وہاں رکنا بھی گوارہ نہ کیا سیدھی کچن کی طرف بڑھی۔کچن کے دروازے پر رک کر اس نے گھوم کر دیکھا تو عبداللہ کو اپنی طرف متواتر متوجہ دیکھ کر وہ شرما کر تیزی سے اندر گھس گئی۔

عبداللہ اور اس کی فیملی کو آئے ابھی تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ عبداللہ کا کزن ریحام اور اس کی فیملی بھی آن دھمکے۔ریحام کی فیملی راولپنڈی سے آئی تھی۔ریحام عبداللہ کے پاس آکر بیٹھا اور جلد ہی دونوں کے درمیان کافی گپ شپ چل پڑی۔

عبداللہ کی نگاہیں بار بار کچن کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ جہاں وہ پری پیکر موجود تھی۔اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے پیچھے چلا جائے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ایک بہت بڑا قدم ہے۔جس کی وجہ سے اس کی فیملی کی عزت داؤ پر لگ جائے گی۔

برداشت کی تمام تر حدیں اس کے کنٹرول سے باہر ہو چکی تھیں۔اور پھر جلد ہی اسے اک بار پھر اس اپسرا کا دیدار نصیب ہوا۔انیلہ کھانے کے برتن اٹھائے کچن سے باہر نکلی اور برتن لیے ڈائننگ روم میں گھس گئی۔اس نے عبداللہ کی طرف یا کسی کی طرف بھی دھیان نہیں دیا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ خود بھی عبداللہ میں انٹرسٹڈ ہو گئی تھی۔لیکن اس میں اتنی جسارت نہ پیدا ہو پا رہی تھی وہ اس کی طرف دیکھ پاتی۔

وہ اس بات سے بھی بخوبی آشنا تھی کہ عبداللہ کی نگاہیں اسی پر مرکوز ہیں لیکن ٹی وی لاؤنج میں مہمانوں کا جم غفیر لگا ہوا تھا۔اور وہ کسی کے سامنے کوئی تاثرات عیاں نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر برتن سجانے کے بعد وہ الٹے قدموں واپس پلٹی اور ایک بار پھر بے خیالی میں سیدھی کچن میں جا گھسی۔ کچن میں داخل ہوتے ساتھ ہی اس نے گہری گہری سانسیں لینا شروع کر دیں تو اس کی ماں نے حیرت سے اسے گھورا۔

"خیریت تو ہے ناں.....؟" اس کی ماں نے پوچھا۔

"میں تھک گئی ہوں....." انیلہ نے سفید جھوٹ بولا۔

اس کی ماں نے حیرت سے اسے ایک بار پھر دیکھا۔وہ جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے لیکن کیوں یہ بات سمجھنے کے لیے اس کے پاس بھی وقت نہ تھا۔

☆-----☆-----☆

عبداللہ کی فیملی کو اسلام آباد میں دو دن ہو گئے تھے۔ اس دوران عبداللہ نے کسی دوست سے کوئی رابطہ کیا تھا نہ ہی اس کے کسی دوست نے اس سے رابطہ کیا تھا۔

آفتاب اس وقت محمد یوسف کے گھر موجود تھا۔ اس نے اعجاز سے رابطہ کیا تو وہ بھی گھر پر ہی موجود تھا۔ آفتاب نے اسے کہا کہ اگر فری ہو تو محمد یوسف کے گھر آ جاؤ تو اس نے تھوڑی دیر میں پہنچے کا کہا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔ کال منقطع ہوتے ساتھ ہی وہ یوسف کی طرف متوجہ ہوا۔

"عبداللہ سے کوئی رابطہ ہوا کیا......؟"

"نہیں مجھے تو نام نہیں ملا اور اس نے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا۔" محمد یوسف نے بتایا۔

"مجھ سے بھی اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔" آفتاب نے بتایا۔

"شاید کزنوں میں جا کر بھول گیا ہو۔" محمد یوسف نے پیشن گوئی پیش کی۔

"اتنی جلدی۔" آفتاب ہنسا۔

"کچھ خاص بھی ہوتے ہیں۔" محمد یوسف بولا تو آفتاب نے اس کی بات سمجھتے ہوئے زوردار قہقہہ لگایا

"مجھے نہیں لگتا کہ کوئی اس کے لیے بھی خاص ہوگا۔" آفتاب بولا۔

"کچھ لوگ اپنی اہمیت خود اجاگر کر دیتے ہیں۔" محمد یوسف نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ کسی لڑکی کے چکر میں...... امپاسبل۔" آفتاب ایک بار پھر کھل کر ہنس دیا۔

اتنے میں اعجاز بھی پہنچ گیا۔ اعجاز کے پہنچتے ساتھ ہی محمد یوسف پانی کی ٹھنڈی بوتل لے آیا۔ اور گھر میں چائے کا آرڈر دے آیا۔

"کیا بات ہے آج کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو؟" اعجاز نے سوال داغا۔

"ہم یہاں قہقہے پہ قہقہہ ہانک رہے ہیں اور تم کہہ رہے ہو کہ پریشان دکھائی دے رہے ہو۔" محمد یوسف نے کہا۔

"تو قہقہے کس بات پہ......؟" اعجاز نے خالی گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس ایسے ہی۔" محمد یوسف نے ٹال مٹول کرتے ہوئے کہا۔

"عبداللہ سے کوئی رابطہ ہوا کیا......؟" اعجاز نے پوچھا۔

"نہیں فی الحال تو کوئی نہیں ہوا......" اب کی بار آفتاب نے جواب دیا۔

یوسف اٹھ کر اندر چلا گیا۔ جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی۔ جس میں تین چائے کے کپ اور ایک پلیٹ میں بسکٹ اور دوسری پلیٹ میں مٹھائی رکھی ہوئی تھی۔

"تمہارا تو وہ سب سے قریبی دوست ہے کیا واقعی اس نے تم سے بھی رابطہ نہیں کیا......؟" اعجاز نے چائے کی چسکی بھرتے ہوئے کہا تو یوسف اور آفتاب دونوں نے حیرت سے اسے گھورا۔

"کیا تمہارے ساتھ اس کی کوئی دشمنی چل رہی ہے۔" آفتاب نے ناگواری سے کہا۔

"نہیں......!" اعجاز نے انکار کیا۔ ج

"لیکن وہ یوسف کا تو سب سے زیادہ قریبی دوست ہے اپنی ہر بات اس سے شیئر کرتا ہے۔"

"وہ سب کے ساتھ ایک سا ہے۔" یوسف نے بسکٹ چائے میں ڈبوتے ہوئے کہا۔

"یہ الگ بات ہے کہ تمہارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت الگ ہے۔"

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ میں اس سے جیلس ہوتا ہوں۔" اعجاز نے چڑ اس ناگواری سے پوچھا۔

"پلیز یار۔" آفتاب نے چڑ اس غصے سے اسے ٹوکا۔

"اب اس ٹاپک پہ کوئی بات نہیں ہوگی۔"

اعجاز کو اس کی بات پر کافی غصہ آیا لیکن وہ چپ کر گیا جبکہ یوسف کو اس سے زیادہ اس کی سوچ پر منکھ ہوا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ اس کی فطرت ہے۔

☆-----☆-----☆

عبداللہ اور اس کی فیملی کے ساتھ ریحام کی فیملی کے آجانے کی وجہ سے رونقیں دوبالا ہو گئی تھیں۔ عبداللہ اور ریحام میں کافی علیک سلیک بن گئی تھی۔ رات کے وقت سب کزن وغیرہ جب اکٹھے بیٹھے تو سب میں خوب گپ شپ چلنے لگی۔ اس دوران عبداللہ اور انیلہ کے درمیان کوئی خاص بات نہ ہو سکی۔ دونوں بار بار چپکے سے نگاہیں اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھتے اور دونوں کے لبوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔ وہ دونوں اپنی اندرونی کیفیت کسی پر عیاں نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن وہ اس بات سے آشنا نہ تھے کہ ریحام کی نگاہیں پیہم ان دونوں کا پیچھا کر رہی تھیں۔

ریحام ساری بات سمجھ چکا تھا لیکن اس نے دونوں پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا تھا۔ لیکن یہ بات بھی سچ تھی کہ اندر ہی اندر وہ جل بھن کر رہ گیا تھا۔ ریحام انیلہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا لیکن وہ بھی کہ اسے گھاس تک نہ ڈالتی تھی۔ لیکن اس وقت جو کچھ ریحام دیکھ چکا تھا۔ وہ ساری بات سمجھ چکا تھا۔

دل ہی دل میں اس نے عبداللہ اور انیلہ کے درمیان پھوٹ ڈالنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ لڈو آئی تو سب کھیلنے کے لیے تیار ہو گئے اور اتفاق سے انیلہ اور عبداللہ کو ساتھ ساتھ کھانے مل گئی۔ ریحام اور انیلہ کی سسٹر ایک سائیڈ پر ہو گئی۔

ریحام نے دیکھا کہ بیٹھے بیٹھے عبداللہ نے انیلہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو انیلہ نے شرما کر جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا کہ ان دونوں کے حساب سے کسی نے نہیں دیکھا ہوگا لیکن وہ اس بات سے قطعی آشنا نہ تھے کہ دو آنکھیں پیہم انہی پر مرکوز تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ریحام نے عبداللہ کو ساتھ لیا اور کمرے سے باہر نکل کر ٹی وی لاؤنج میں جا کر بیٹھ گئے۔ عبداللہ کا تو وہاں سے اٹھنے کو من بھی نہیں کر رہا تھا لیکن ریحام نے ضد کر کے اسے وہاں سے اٹھایا تھا۔ اس کی اس حرکت پر انیلہ نے بھی اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا تھا۔ یہی نہیں انیلہ کی سسٹر نے تو باقاعدہ احتجاج کرتے ہوئے ریحام کو پکارا:

"وٹ اذ دس ریحام۔ ہم لوگ گیم کھیل رہے ہیں۔ تمہیں یک دم کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں یار" ریحام نے مصنوعی ہنسی لبوں پر پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔

"جتنا یہ تمہارا کزن ہے اتنا میرا بھی ہے۔ اب ہم دونوں اکٹھے بیٹھ کر کچھ دیر گپ شپ کریں گے۔"

جوابًا انیلہ کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔ جب کہ انیلہ دل ہی دل میں اسے کوسنے لگی۔

انیلہ کی حالت دیکھ کر ریحام کو دل ہی دل میں کافی راحت محسوس ہوئی۔ انیلہ نے اس کی محبت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جواس کی ہتک کی تھی۔ اس نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بہر صورت انیلہ کو اس کا جواب دے گا۔

ٹی وی لاؤنج میں ان کی آمد سے قبل وقاص اور یسین براجمان تھے۔ دونوں کزن ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ وقاص امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا تھا۔ جبکہ یسین ابھی آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا۔ تھوڑی دیر سب میں گفت و شنید چلتی رہی۔

جلد ہی وقاص ان سے معذرت کر کے اٹھ کر سونے کے لیے چلا گیا اور پھر اس کی دیکھا دیکھی یسین بھی اٹھ کر چلا گیا۔ اب ریحام کے سامنے میدان خالی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کا پھینکا ہوا ہر تیر نشانے پر جا کر لگے گا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ عبداللہ بھی دور شناس لڑکا ہے۔ وہ بلا وجہ کسی کی بات پر یقین نہیں کرتا جب تک کہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ جائے۔

"سنا ہے رزلٹ کافی اچھا آیا ہے تمہارا......؟" ریحام نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں۔" عبداللہ نے مختصر سا جواب دیا۔

"تو آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" ریحام نے دوسرا سوال داغا۔

"فی الحال کچھ سوچا نہیں۔" عبداللہ نے جواب دیا۔

"میرا ارادہ آئی سی ایس کرنے کا ہے۔" ریحام نے بتایا۔

"اچھی بات ہے۔" عبداللہ نے کہا۔

"کیوں نہ ہم دونوں مل کر آئی سی ایس کریں۔" ریحام نے مشورہ دیا۔

"مطلب......؟" عبداللہ نے سوالیہ نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ یا تم میرے پاس آ جاؤ یا میں تمہارے پاس آ جاتا ہوں اور دونوں مل کر ایک ہی جگہ پڑھتے ہیں۔" ریحام نے وضاحت پیش کی۔

"میرے پیرنٹس مجھے یہاں کسی طور نہیں بھیجیں گے۔" عبداللہ نے اپنی مجبوری سامنے رکھی۔

"تو اگر میں......آ جاؤں تو کوئی پرابلم تو نہیں؟" ریحام نے رک کر فقرہ مکمل کیا اور نگاہیں عبداللہ کے چہرے پر گاڑھ کر اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی۔

"کیا پرابلم ہوگی......؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"تمہارا اپنا گھر ہے یار بے شک جب جی چاہے آ جانا۔ اور ویسے بھی مجھے بھی اچھی کمپنی مل جائے گی۔"

عبداللہ نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ "یہی تو میں چاہتا ہوں کہ ایک بار تو مجھے اپنے ساتھ تو رکھ۔" ریحام زیر لب بڑبڑایا۔

"تم نے کچھ کہا؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" ریحام نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہارے والدین تمہیں اجازت دے دیں گے؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" ریحام نے بتایا۔

"او کے۔ یو ویلکم۔" عبداللہ نے مسکرا کر کہا اور دونوں گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔

☆-----☆-----☆

یوسف اس وقت مارننگ واک کے لیے پارک میں آیا تھا۔کافی دیر ورزش کرنے کے بعد جب وہ ایک طرف بنے سیمنٹ کے بینچ پر بیٹھا تو تھوڑی ہی دیر میں آفتاب اور اعجاز بھی وہاں آن دھمکے۔دونوں نے اسے سلام کیا تو اس نے دھیرے سے سلام کا جواب دیا۔

"کیا ابھی تک ناراض ہو یار......؟"اعجاز نے پوچھا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ پارک میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا جہاں درجنوں مرد وزن ورزش اور چہل قدمی کر رہی تھیں۔

"اسے اپنی غلطی پر افسوس ہے۔"آفتاب نے اعجاز کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

"ہم لوگ دوست ہیں۔یوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر اگر منہ لگا کر بیٹھیں گے تو ہمارے تعلقات میں کافی نشیب فراز پیدا ہو سکتے ہیں۔لوگ ہم پر ہنسیں گے۔جب ایک بندہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے معافی کا خواستگار ہو تو میرے خیال میں اتنا موڈ نہیں بنانا چاہیے۔"

آفتاب کی بات سن کر یوسف نے اسے کھا جانے والی آنکھوں سے گھورا۔

"غلطی ایک آدھ بار ہوتی ہے بار بار نہیں۔"یوسف نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"آخر کب تک یہ غلطیاں کرتا رہے گا اور معافیاں مانگتا رہے گا۔بچپنے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔اس کے منہ پر تو اب مونچھ داڑھی بھی بڑھ گئی ہے۔پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا انسان ہے۔اس کے باوجود اسے بات کرنے کے آداب کا نہیں پتہ۔انسان کو بات کرنے سے پہلے چنداں غور ضرور کر لینا چاہیے کہ آیا جو الفاظ میں استعمال کرنے لگا ہوں۔اس سے سامنے والے کو تکلیف تو نہیں ہو گی۔"

"ارے یار کہا ناں جب وہ اپنی غلطی کی معافی مانگنے آیا ہے تو پھر اتنے غصے ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"یوسف بولا۔

"رہی بات اگلی تو آئندہ اگر یہ ایسی حرکت کرے گا تو ہم سب اس سے بائیکاٹ کریں گے۔"

"مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم لوگ بائیکاٹ کرو یا کیا کرو۔"یوسف متوازن ہی لہجے میں بولا۔

"لیکن یہ بات بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ ہم چاروں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔اب ہم ایک دوسرے کو یہ کہتے پھریں گے کہ دوسرا تمہاری سپورٹ میں زیادہ ہے تو گویا اس کے ذہن میں فتور ہے۔اور یہی فتور رشتوں میں دراڑیں پیدا کرتا ہے۔کم از کم بات کرنے سے پہلے انسان کو سوچ سمجھ لینا چاہیے کہ آیا مجھے ایسی باتیں کرنی ہیں یا نہیں۔"

"پلیز یار کول ڈاؤن۔"آفتاب نے یوسف کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"افسوس ہوتا ہے یار اس کی باتوں سے۔"یوسف خون کے گھونٹ پیتے ہوئے بولا۔

"اگر وہ میرا قریبی زیادہ ہے تو مجھ میں کوئی اچھائی ہے تو وہ مجھ سے اتنا قریبی ہے۔اگر مجھ پر یا اس پر بحث کرنے کی بجائے یہ اس اچھائی کو جانچ کر اپنے اندر پیدا کر لے تو ایک عبداللہ نہیں پوری دنیا اس کی دیوانی ہو جائے گی۔اور وہ خوبی صرف اخلاق ہوتا ہے۔"

تھوڑی دیر تک تینوں دوستوں میں بحث و مباحثہ ہوتا رہا لیکن بالآخر آفتاب یوسف کو ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اس نے دونوں کو گلے لگوایا۔ پارک میں چہل قدمی اور ورزش کرتے کئی لوگوں نے ان کی طرف دیکھا۔

☆-----☆-----☆

"میں جانتا ہوں کہ تم انیلہ میں اور وہ تم میں انٹرسٹڈ ہے۔" ریحام نے عبداللہ سے سرگوشیانہ انداز میں کہا تو عبداللہ حیرت کے مارے اچھل پڑا کہ اسے اس بات کا علم کیسے ہوا؟

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔" عبداللہ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"مجھے وضاحتیں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔" ریحام نے کہا۔

"میں نے تم دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے بے پناہ محبت دیکھی ہے۔"

"پلیز ریحام۔" عبداللہ نے اسے چپ کروانے کے لیے کہا۔

"ٹینشن مت لو میں کسی کو بتانے والا نہیں ہوں۔" ریحام بولا۔

"ویسے بھی اب ہم دونوں کزن ہونے کے ساتھ ساتھ دوست بھی ہیں یار ایک دوسرے سے کچھ بھی پوشیدہ رکھنا بہتر نہیں ہے۔ اور ویسے بھی تمہیں اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انیلہ تمہاری کزن ہے۔ جس رشتے میں پہلے دراڑیں پیدا ہو چکی تھیں اگر وہ رشتہ ایک ہو جائے تو دوبارہ کبھی کوئی بھی اس رشتے میں دراڑیں پیدا نہیں کر پائے گا۔"

عبداللہ نے ریحام کی بات سن کر اس کی طرف بغور دیکھا۔ اسے ریحام کی آنکھوں میں اپنے لیے اپنائیت دکھائی دی لیکن وہ اس بات سے واقف نہ تھا کہ وہ ایک آستین کے سانپ سے دھوکہ کھانے والا ہے۔ جو اسے کل دینے کے لیے پر تول رہا تھا۔

"تم صحیح سمجھے ہو۔" عبداللہ نے بالآخر ہار مانتے ہوئے کہا۔

"انیلہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔ میں تو اس بات سے پریشان ہوئے جا رہا ہوں کہ نجانے اب ہماری ملاقات کب ہوگی؟ پتہ نہیں ہو بھی سکے گی یا نہیں؟"

"ارے اتنی سی بات پر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" ریحام بولا۔

"میں ہوں ناں (سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے) اب جب ہم دونوں اکٹھے رہیں گے اور میں جب بھی گھر آنے لگوں گا تو تمہیں ساتھ لے کر آیا کروں گا یوں تم دونوں کی ملاقات بھی ہو جایا کرے گی اور فرینڈ شپ بھی۔"

"تم واقعی بہت اچھے ہو۔" عبداللہ نے ریحام کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو وقت آنے پر تمہیں معلوم پڑے گا۔" ریحام نے دل ہی دل میں کہا۔

☆-----☆-----☆

نادیہ کو جب انیلہ کے ہاں مہمانوں کی خبر ملی تو فوراً دوڑی چلی آئی۔

"ارے تم.....؟" انیلہ نے اسے یک دم دیکھ کر پوچھا۔

"میں نے سنا ہے تمہارے گھر میں کافی سارے مہمان

آئے ہوئے ہیں؟" نادیہ نے پوچھا۔

"تو......؟" انیلہ نے حیرت سے اسے گھورا۔

"تو کیا......؟" انیلہ غصے ہو کر بولی۔

"ایک تو تم دو دن سے کالج نہیں آ رہی اوپر سے غصے بھی ہو رہی ہو۔ میں تو اس لیے دوڑی چلی آئی کہ چلو تمہارے ساتھ کچھ ہاتھ ہی بٹا دوں۔"

"واہ کیا بات ہے؟" انیلہ نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

"اتنی مہربانی کس لیے......؟" انیلہ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

"کیونکہ تم میری دوست ہو یار۔" نادیہ نے بتایا۔

انیلہ کچن میں گھس گئی جبکہ نادیہ ٹی وی لاؤنج میں براجمان سب مہمانوں سے مل کر آئی۔ تبھی اس کی نگاہ عبداللہ پر پڑی اور وہ دل اس کے قدموں میں پھینک بیٹھی۔ اتفاق کی بات کہ دوسری طرف ریحام نے نادیہ کو دیکھا تو اس کے لیے دل میں میٹھے جذبات محسوس کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ انیلہ نہ سہی چلو اس کی دوست سہی۔

"ارے واہ تمہارا کزن تو کافی خوبصورت ہے۔" نادیہ نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

انیلہ نے اسے سوالیہ نگاہوں سے گھورا۔

"کون سا......؟"

"ارے وہی جو دادی ماں کے پاس بیٹھا ہے۔" نادیہ نے بتایا۔

انیلہ سمجھ گئی کہ وہ عبداللہ کی بات کر رہی ہے۔ اسے سر تا پاؤں مرچیں لگیں۔

"کیوں اب اس پر بھی منڈلانے لگا ہے کیا......؟" انیلہ نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں......" نادیہ بولی تو انیلہ نے سکھ کا سانس لیا۔

"مگر ہو بھی سکتا ہے۔"

"تم میرے ہاتھوں مرنہ جانا۔" انیلہ نے کھا جانے والی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"ایکسکیوزمی۔" نادیہ نے ناگواری سے کہا۔

"جس مقصد کے لیے آئی ہو۔ وہ کام کرو۔" انیلہ گویا ہوئی۔

نادیہ نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے اسے گھورا اور اس کے ساتھ کام میں مصروف ہو گئی۔

☆......☆......☆

شام کے سائے چھلنے سے قبل عالیہ انیلہ کے ہاں آن پہنچی اور اس سے رابطہ نہ کرنے اور میسج کا جواب نہ دینے کی وجہ پوچھی۔

"ارے یار تمہیں بتایا تو تھا کہ گھر میں کافی سارے مہمان ہیں۔" انیلہ نے بتایا۔

"تو کیا گھر میں مہمان ہوں تو میسج کا جواب دینے اور رابطہ کرنے سے کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے کیا؟" عالیہ نے سوالیہ نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو......؟" انیلہ بولی۔

"تو پھر......؟" عالیہ نے پوچھا۔

"اچھو کی......" انیلہ نے وضاحت کرنی چاہی لیکن عالیہ نے اسے ٹوکا۔

"لگتا ہے کوئی خاص مہمان آیا ہے......؟" عالیہ نے اس کی چوری پکڑتے ہوئے کہا تو انیلہ شرم سے مسکرا کر رہ گئی۔

"مجھے نہیں ملواؤ گی اس سے؟"

"ایسے کیسے.....؟" انیلہ گویا ہوئی۔

"چلو دیدار ہی کروا دو۔" عالیہ نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"ہم بھی تو دیکھیں کہ تمہاری پسند کیسی ہے؟"

"وہ بہت پیارا ہے عالیہ۔" انیلہ نے بتایا۔

"پہلی نظر میں اس پر فدا ہو گئی ہوں۔ نجانے کیوں دل ہول رہا ہے کہ اگر وہ چلا گیا تو میں اس کے بغیر رہ نہیں پاؤں گی۔"

"ارے یہ کیا بات ہوئی تو ساتھ چلی جاؤ اس کے۔" عالیہ نے مشورہ دیا۔

"پلیز یار آئی ایم سیریس۔" انیلہ بولی۔

"اتنا سیریس مت لو۔" عالیہ بولی۔

"دل کے مچلنے اور بے قرار ہونے کو قابو میں رکھو۔ پہلے مدمقابل کے حالات وجذبات سے آگہی حاصل کرو۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں راہ محبت میں تنہا چھوڑ جائے۔ تمہیں نہیں پتہ کہ جب کوئی محبت کے اس چوراہے پر جہاں سے لوٹنے کا کوئی راستہ ہی نہ ہو ساتھ چھوڑ جائے تو انسان کرچیاں کرچیاں ہو جاتا ہے۔"

"وہ ایسا نہیں ہے۔" انیلہ بولی۔

"کسی کے چہرے پر اس کے اندرونی جذبات واحساسات اور احوال لکھے نہیں ہوتے۔" عالیہ نے کہا تو انیلہ نے اسے بغور دیکھا۔

"آج تو بڑی دور تک کی باتیں کر رہی ہو خیر تو ہے؟" انیلہ نے پوچھا۔

"بس میں چاہتی ہوں کہ میری طرح تم بھی بکھر نہ جاؤ۔" عالیہ نے ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"ایسا نہیں ہوگا۔" انیلہ نے پر یقین انداز میں جواب دیا۔

☆.....☆.....☆

عبداللہ نے اپنے والدین سے ریحام کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے بلاچوں چراں خوشی سے کہا کہ وہ جب تک چاہے ان کے ہاں رہے۔ دوسری طرف ریحام نے اپنے والدین سے بات کی تو انہوں نے بھی بنا کسی عذر کے اجازت دے دی۔

دونوں اپنی اپنی جگہ خوش تھے۔ عبداللہ اس لیے خوش تھا کہ ریحام کا اس کے ساتھ ہونا ہر لحاظ سے بہتر تھا۔ ایک تو وہ اس کے ذریعے بہت جلد انیلہ سے ملاقات کر سکتا تھا۔ دوسرا ان دونوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بھی وہ بن سکتا تھا۔

دوسری طرف ریحام کو انیلہ سے جتنی محبت تھی اس سے دوگنی اس سے نفرت ہو چکی تھی۔ اور اب وہ ہر قیمت پر اسے ناکوں چبوانا چاہتا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ ان دونوں کے درمیان میں پہلے وہ بے پناہ محبت پیدا کرے گا اور پھر یک لخت عبداللہ کے دل میں انیلہ کے لیے اتنی نفرت پیدا کرے گا کہ عبداللہ انیلہ کو چھوڑ دے گا۔

یوں انیلہ ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ پھر وہ اس کی منتیں کرے گی اور اس وقت وہ اسے اس کی اوقات یاد دلائے گا۔ عبداللہ سے زیادہ ریحام خوش تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ عبداللہ کے ساتھ رہ کر وہ اپنے مقصد میں اب جلد ہی کامیاب ہو جائے گا۔ (جاری ہے)

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

انچارج: اطہر اقبال مغل

پھر نہ کیجیے میری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھیے آپ نے پھر سے دیکھا مجھ کو

(انتخاب: افتخار احمد۔۔۔۔بھلریاں گوجڑی)

آیا ہی تھا خیال کہ آنکھیں چھلک پڑیں
آنسو کسی کی یاد میں کتنے قریب تھے

(انتخاب: محمد سلیم۔۔۔۔بھیر سوئیاں قصور)

میری یادوں سے بچ نکلو تو یہ وعدہ رہا تم سے
میں خود دنیا سے کہہ دوں گا کمی میری وفا میں تھی۔

(اسحاق نجم۔۔۔۔کنگن پور)

نہیں سجدے کئے کبھی غیروں کی چوکھٹ پہ
جس کی ضرورت ہو خدا سے مانگ لیتے ہیں
راتوں کو سو نہ پاؤں اب اتنا بھی ظلم نہ کر فراز
دیکھ صبح ہوگئی ہے تجھے یاد کرتے کرتے

(محمد ذیشان۔۔۔۔کراچی)

بات دن کی نہیں اب رات سے ڈر لگتا ہے
گھر ہے کچا میرا برسات سے ڈر لگتا ہے
پیار کو چھوڑ کر تم کوئی اور بات کرو
اب مجھے پیار کی ہر بات سے ڈر لگتا ہے

(شرف الدین جیلانی۔۔۔۔ٹھٹھہ والا)

ہر روز اک نیا امتحان لیتی ہے زندگی
ہر روز اک نیا صدمہ دیتی ہے زندگی
زندگی سے شکوہ بھی کیسے کریں
آپ جیسے دوست بھی دیتی ہے زندگی

(شہلا اختر۔۔۔۔کراچی)

ویک روح کے اندر ہے
باہر سے شاداب ہیں ہم

(فلک زاہد۔۔۔۔لاہور)

ساحل کو دیکھ دیکھ کریوں مطمئن نہ ہو
اکثر سفینے ڈوبتے ہیں ساحل کے آس پاس

(انس حبیب خان۔۔۔۔کراچی)

کلی پہ قطرہ شبنم کا دکھ عیاں نہ ہوا
امید وار تھے ہم بھی اسے گماں نہ ہوا
تمام شہر میں اس کے کرم کے چرچے تھے
یہ اور بات تھی کہ وہ ہم پہ مہرباں نہ ہوا

(سنبل ماہین طاہر۔۔۔۔پنڈداد خان)

دوست سمجھ کر حال دل نہ سنانا دوست
ہر اک ہم راز نہیں ہوتا دوست
ایک مسکراہٹ کے ہوتے ہیں ہزار معنی
ہر مسکراہٹ کو محبت کا اشارہ نہ سمجھ دوست

(عبدالعزیز بلوچ۔۔۔۔کراچی)

پیتے نہیں ہم شوق سے شراب
اگر کوئی دشمن نہ پھیلاوے
دوستوں کا کیا پتا ہے یہاں

کوئی شہد میں زہر نہ ملاوے

(اکبر.....کراچی)

ڈرتے ہیں ان میں بھی نہ ہواپناکوئی رقیب
لیتے ہیں دوست سے بھی چھپ کر کسی کا نام

(محمد طاہر.....نمائندہ شاہین ڈائجسٹ)

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات اچھی ہے میرے ہر جائی کی

(محمد سفیان.....نمائندہ شاہین ڈائجسٹ)

تیری سیاہ زلف کی یاد میں آنسو چمکتے ہیں
اندھیری رات ہے، برسات ہے جگنو چمکتے ہیں

(انجاز احمد.....بھلریاں کھوڑی)

عید آئی تم نہ آئے کیا مزہ ہے عید کا
عید ہی تو نام ہے اک دوسرے کی دید کا

(محمد عادل خان بلوچ.....ساہیوال)

کون کہتا ہے اندیشہ رسوائی ہے
آج تو گلے لگ جاؤ عید آئی ہے

(محمد عادل خان بلوچ.....ساہیوال)

اگر شب فراق سے وحشت اسے بھی تھی
میری طرح کسی سے محبت اسے بھی تھی
تنہا ہوا سفر میں تو مجھ پہ کھلا یہ بھی
سائے سے پیار دھوپ سے نفرت اسے بھی تھی

(انس حبیب خان.....کراچی)

دوست بھی کیا خوب وفا کا صلہ دیتے ہیں
ہر اک گام پہ زخم نیا دیتے ہیں
آپ سے تو چند دنوں کی دوستی ہوئی

لوگ برسوں کی محبت کو بھلا دیتے ہیں

(ملک اے بی شاہین.....سلانوالی، سرگودھا)

کی ہم سے محبت تھی تو کچھ تو پاس رکھتا تھا
ہمیں اپنی نگاہوں میں کچھ تو خاص رکھتا تھا
کر دیا دل سے دور غم یہ نہیں محسن
پر کبھی تو اپنی یادوں میں ہمیں بھی یاد رکھتا تھا

(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈو الہ یار)

چاند آتا ہے شب کے پردے میں
دیکھنے کو تیری جھلک تنہا
چاند تاروں سے کہہ گیا سورج
تھک گیا ہوں چمک چمک کے تنہا

(حافظ محمد بلال اسلم.....سلانوالی، سرگودھا)

یاد تو یاد ہے کب تک تنگ کرے گی
ہاں زندگی جینے کی آرزو میرے سنگ رہے گی
ہم چھوڑیں گے بچھڑے ہوئے ہوئے لوگوں کے رستے
اپنی راہ چلیں گے روئی جو ساتھ ہم آہنگ رہے گی

(عالیہ ارم.....132 جنوبی سلانوالی)

آیئے بیٹھئے حکم کیجئے کیا پیش کروں
دل حاضر جاں حاضر ارمان حاضر جان حاضر

(محمد ابو ہریرہ بلوچ.....پہاڑ نگر)

نہ وعدہ نہ دلاسا نہ تسلی نہ دعا
اس نے اس بار جاتے ہوئے قیامت کر دی

(کائنات طارق.....132 جنوبی سلانوالی)

☆.....☆.....☆

آپ بھی ہمیں اشعار بھیجیں تا کہ قریبی شمارے میں شائع ہوں۔

غزل

تجھ سے ملنے کی ہمیں فرصت نہیں ملتی
کس سے پوچھوں تیری انجمن میں محبت نہیں ملتی
تازہ زخم ہیں یاد رکھوں گا تا حشر تک
زندگی میں ایک پل کے لیے راحت نہیں ملتی
حقات سے مت دیکھ میں بھی انسان ہوں
شیشہ گروں کے شہر میں محبت نہیں ملتی
تیری پلکوں پہ سجتے ہوئے اشکوں کی قسم
بے قرار زندگی میں پھر تیری عنایت نہیں ملتی
کانٹوں کے درمیان گزری ہے زندگی جاوید
غم سے ہمیں پھر بھی نجات نہیں ملتی

(محمد اسلم جاوید۔۔۔۔فیصل آباد)

مارچ اپریل کے دن بھی
کتنے عجیب ہوتے ہیں
جب جب پھول کھلتے ہیں
دل مرجھانے لگتے ہیں
کچھ بچھڑے ہوئے لوگ یاد آنے لگتے ہیں
یوں تو بھری بہار میں ہر طرف خوشبو آتی ہے
دل کو نہ جانے کس کی جستجو ہوتی ہے
جب یہ مہکی فضائیں آتی ہیں
گزرا وقت یاد دلاتی ہیں
یہ جو ہر طرف گل کھلے ہوتے ہیں
دل میں یادوں کے نشتر چبھوتے ہیں
کون کہتا ہے
کہ بہاریں خوشیاں لاتی ہیں
یہ تو اداسیوں سے دامن بھر جاتی ہیں

(محمد شہریار اسلم۔۔۔۔سلانوالی، سرگودھا)

بن کے انجان وہ پہلو سے گزر جاتے ہیں
دل کو بے چین مرے اور بھی کر جاتے ہیں
وہی دیتے ہیں جنہیں دیتا ہے توفیق خدا
مانگنے والے صدا دے کے گزر جاتے ہیں
تھا کبھی ان کی چاہت کا جہاں میں چرچا
اب تو یہ حال ہے پرچھائیں سے ڈر جاتے ہیں
یاد رہ جاتے ہیں احباب کے لطف وکرم
باقی رہتے ہیں نشان زخم تو بھر جاتے ہیں
کون رکھے گا بھلا ان سے اب امید وفا
جب وہ اقرار وفا کرکے مکر جاتے ہیں
حوصلہ دل میں جوان ہو تو کچھ نہیں مشکل
بس ذرا دیر میں حالات سنور جاتے ہیں
ان کا غم دل میں بسا ہو تو کوئی بات بھی ہو
مرے نالے بھی لئے امتیاز کا اثر جاتے ہیں

(ایس امتیاز احمد۔۔۔۔کراچی)

وہ رندوں میں شامل نہ ہوں زاہداں میں
گزر ہی رہی ہے غم جاوداں میں
نگاہوں سے اک دن پلا کر یوں چھوڑا
زمیں ہے نہ حاصل نہ ہوں آسماں میں
تڑپ میں ہماری تڑپ وہ نہیں ہے

اثر اب نہیں ہے وہ آہ و فغاں میں
مٹانے لگے ہیں وہ یوں ذات میری
مرا نام شاید ملے داستاں میں
میری خواہشوں کا قتل کرنے والے
بنے اب مسیحا پھرے ہیں جہاں میں
چلا جا تو واپس اجالوں کے راہی
اندھیرا بہت ہے مرے آشیاں میں
صدائیں ہماری سنے کاش راشد
لہو بن کے رہتا ہے جو جسم و جاں میں

(راشدعلی مرکھیانی)

پیام ازل میرے نام بے شمار آئے
قریب مرگ ہوا میں تو میرے یار آئے
عذاب ہجر میری زندگی کو لے ڈوبا
رہی نہ جان سلامت تو جاں نثار آئے
عجیب عشق تیری راہ کی مسافت ہے
کہ جو بھی راہ چلے ہو کے سوگوار آئے
سکون و چین و محبت تمہیں مبارک ہو
کہ ہم تو ہجر و اذیت میں ہی گزار آئے
وہ ساتھ تھا تو میری زندگی میں تھی خوشیاں
بچھڑ کے اس سے میرے پاس غم ہزار آئے
لبوں پہ سوز و صدا کب بھلا سجایا تھا
بس اسکی بزم سے آئے تو اشکبار آئے
دیارِعشق میں صدقہ دیا ہے یوں راشد
جو ایک جان بچی تھی سو وہ بھی وار آئے

(راشدعلی مرکھیانی)

یہی دعا کیوں میرے لب پہ بار بار آئے
ملو کبھی کہ میرے درد کو قرار آئے
کبھی کبھی تو تیری دید کروں میں ٹھہر
میری گلی میں صنم تو کبھی کبھار آئے
کہ خود کو ہم نے بنایا ہے مے کا دیوانہ
پلاؤ آنکھ سے ہم ہو کے بادہ خوار آئے
فدا ہیں سارے زمانے کی رونقیں تم پہ
میری دعا ہے تیرے حسن میں نکھار آئے
کبھی چمن کے آس پاس سے جو تو گزرے
خزاں کی رت میں اچانک کوئی بہار آئے
ملا کر آنکھ میں نے ہوش کھو دئے سارے
جو تم نے آنکھ ملائی تو سو خمار آئے
فدا تھا سارا زمانہ ہی ساقی پہ تری
غضب کیا کہ اپنے آپ کو سنوار آئے
خدا کرے کہ کوئی مجھسے حال ے دل پوچھے
میرے لبوں پہ تیرا نام بار بار آئے
بھلا کے جس نے مجھے درد_دل دیا راشد
اسی کی یاد مجھے کیوں ہے بے شمار آئے

(بقلم: راشدعلی مرکھیانی)

نفرتوں کو بھول جانا چاہیے
غیر کو اپنا بنانا چاہیے
مختصر ہے زندگی کا کارواں
یار ہر پل مسکرانا چاہیے
گر کسی میں عیب کوئی دیکھ لیں
عیب دل میں ہی چھپانا چاہیے

قول پہ قائم رہو اے دوستو
عہد و پیاں کو نبھانا چاہیے
پیٹھ پیچھے بات کرنا چھوڑ دیں
نار سے خود کو بچانا چاہیے
دشمنوں کو دوستی سے جیت لیں
دشمنی کو بھول جانا چاہیے
بانٹنے سے درد شاید دور ہوں
ہر کسی کا غم بٹانا چاہیے
ہے اصول زندگی یہ دوستو
چوٹ کھا کر مسکرانا چاہیے
یہ دعا راشد میری منظور ہو
ہر بشر کو مسکرانا چاہیے

(راشد علی مرکھیانی)

لگ گئے تیرے لارے دیکھو
ہم تم پہ دل ہارے دیکھو
جاگیں میری آنکھیں جب کر
سو گئے چاند ستارے دیکھو
شام سویرے تیری باتیں
لب پہ تیرے نعرے دیکھو
کیسے جیتا ہوں میں تم بن
آ کر میرے پیارے دیکھو
سوکھے من کا گلشن میرے
سونے موسم سارے دیکھو
اب تو آجا میرے ساجن
تم کو پیار پکارے دیکھو
تیری یاد ہے قاتل راشد
ہم کو ہر پل مارے دیکھو

(بقلم: راشد علی مرکھیانی)

دلبر میرے دل کا عالم تو نا جانے
کیسے گزرے سارے موسم تو نا جانے
دلکش دلکش تیری یادیں تیری باتیں
ساتھ ہمارے ہر پل ہر دم تو نا جانے
ساگر دریا بنجر صحرا پربت سارے
تیری خاطر ڈھونڈے جانم تو نا جانے
دھڑکن دھڑکن درد محبت دل میں دھڑکے
کوئی مسیحا ہے نا مرہم تو نا جانے
ہم پہ بیتی ہم ہی جانیں ہم ہی سمجھیں
دشمن ہے یہ سارا عالم تو نا جانے
جل تھل جل تھل بادل برسے تنہا ترسے
ساون برسے چھم چھم چھم چھم تو نا جانے
کس کو جا کر راشد دل کا حال سناؤں
تنہا تنہا میں ہوں جانم تو نا جانے

(راشد علی مرکھیانی)

محبت بھول جاتی ہے
بہت دنوں سے اکی بیرخی کے
سوال سارے
جواب سارے
میں اک کاغذ پہ اتار کر
دل کی گلیاں سنوار کر
لفظ سارے پکار کر

حرف سارے جھاڑ کر
اسکی بیوفائی کو سوچتی ہوں
دل کے کمرے میں سب ہی یادیں
مٹ چکی ہیں
سارے منظر دھل چکے ہیں
سارے موسم بدل چکے ہیں
اسکی نارسائی کے سارے جذبے
من کی سرزمیں سے نکل چکے ہیں
بتاؤ مجھ کو کیا حساب
اسکی باتیں
اسکی یادیں
جو بیوفاؤں کی نگری سے ہٹ چکا ہے
میری دنیا سے کٹ چکا ہے
(مریم ناز)

دعاؤں کے سائے
دن بھر مجھے ڈراتے ہیں
اور میں سہا سہا
تیری گلیوں میں
بھٹکتا رہا لیکن پھر
واپس اپنے ٹوٹے پھوٹے
بوسیدہ مکان کے صحن میں
اسی خیال سے کہ شاید
کوئی بھولے بھٹکے
ہماری دہلیز پر
ضرور آئے گا مگر

اگر شب وصال کے
تھکا دینے والے انتظار
کے بعد بھی کوئی نہ آیا
اور میں اپنی مفلسی
اور حسرتوں کی چادر
اوڑھے ایسے سویا کہ
سورج کی روشن
کرنیں بھی مجھے
جگا نہیں پائیں
(گلاب خان سولنگی ---- نوشہرو فیروز)

کیوں ہے تو مجھ سے خفا، کچھ تو بتا کچھ تو بتا
کیوں ہے تو مجھ سے جدا، کچھ تو بتا کچھ تو بتا
بے وفا کہتا نہیں تو اس میں تری
پیار دوری کی وجہ، کچھ تو بتا کچھ تو بتا
بس یہی ہے تم سے مرا سوال ہے جواب دو
کس جرم کی ہے سزا، کچھ تو بتا
کیا محبت کی عبادت میں صنم مجھ سے بچا
فرض ہے کوئی قضا کچھ تو بتا، کچھ تو بتا
وہ میری تقدیر میں تو نے لکھی ہے کہ نہیں؟
اے خدا! تو ہی بتا، کچھ تو بتا کچھ تو بتا
تم کرو گے مجھ سے دھوکا یہ کبھی سوچا نہ تھا
یہ صلہ کیسا ملا، کچھ تو بتا کچھ تو بتا
ہاں مجھے تو تو سے یہ امید ہی نہ تھی اویس
یہ اچانک کیا ہوا، کچھ تو بتا، کچھ تو بتا
(محمد اویس نور ---- میر پور ماتھیلو)


آزادخیال زندگی
مور شاہد حسین

آزاد خیال زندگی

مور شاہد حسین

ثانیہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی سامنے نسرین بیگم کو سراپا انتظار پایا وہ بغیر ڈرے اعتماد سے آگے بڑھی کہ نسرین بیگم کی آواز اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے کی وجہ بن گئی۔

"کہاں تھی تم؟" نسرین بیگم نے تقریباً گرجتے ہوئے پوچھا۔

"اتنی دیر کیوں لگا دی تم نے کالج سے آنے میں۔کتنی کالز کیں میں نے تم نے وہ بھی Receive نہیں کیں؟"

ایک ہی سانس میں نسرین بیگم کافی کچھ بول گئی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ بات ختم کرتے ساتھ ہی انہیں ایک لمبا سانس لینا پڑا۔اس کی سوالیہ نگاہیں متواتر ثانیہ پر مرکوز تھیں۔

"میں اپنی فرینڈ کے گھر گئی تھی۔" ثانیہ نے پیچھے مڑے بغیر جواب دیا۔

"پلیز آپ میری فکر کرنا چھوڑ دیں۔میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں۔"

ثانیہ اپنی ماں نسرین بیگم کو صلواتیں سنانے لگی وہ بیگم صاحبہ اس کے لہجے وانداز پہ محض کڑھ کر رہ گئی۔

"اسی لیے تو کہتی ہوں کہ تم بچی نہیں جوان ہو گئی ہو احتیاط کیا کرو۔" نسرین بیگم کے لہجے میں ابھی تک کافی نرمی تھی۔

"خوامخواہ آپ کتنی فضول قسم کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔" ثانیہ نے بدتمیزی کی ہر حد عبور کرتے ہوئے پہلی بار مڑ کر کہا۔

"آپ کی یہ بے وقت اور فضول باتیں سر درد کرتی ہیں میرے۔"

اتنا کہہ کر ثانیہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے کی اور بڑھ گئی جبکہ نسرین بیگم اسے جاتے ہوئے محو حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ان کی آنکھوں میں جگمگاتے گوہر ہائے آبدار عیاں تھے۔

نسرین بیگم اپنی بیٹی کی اس قدر بدتمیزی سے نڈھال سی ہو کر صوفے پر تقریباً ڈھے سے گئی۔اور اپنا سر ہاتھوں میں تھام کر بے بسی سے بیٹھی کہ اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا جوان بچوں پر سختی نہیں کرنی چاہیے۔

آج کل کے بچے بڑے جذباتی ہوتے ہیں اور ذرہ ذرہ سی بات پر گھر چھوڑنے میں دیر نہیں لگاتے پھر وہ کچھ سوچ کر ثانیہ کے کمرے کی طرف بڑھیں۔

"کیا تم تو جانتی ہو کہ آج کل کا زمانہ کیسا ہے؟" نسرین بیگم نے ثانیہ کے کمرے میں داخل ہو کر اس کے کندھے پر اپنا دائیں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"خدا جانے کتنے آوارہ لڑکے کسی شکاری کتے کی طرح گلیوں میں گھات لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔میں اپنی بچی کو ان بھوکے شکاری درندوں سے احتیاط کرنے کا کہہ رہی تھی ناں کہ تمہارے اوپر کسی قسم کا کوئی شک کر رہی ہوں۔"

"معلوم نہیں آپ کس زمانے کی دقیانوسی باتیں کر رہی ہیں؟" ثانیہ بھنویں اچکاتے ہوئے کہا۔

"یہ بے جا سختیاں مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔میں خوش مزاج،بے فکر اور آزاد خیال زندگی جینا چاہتی ہوں۔جو میرا دل کرے گا میں وہی کروں گی۔پلیز آپ میری فکر کرنا

چھوڑ دیں۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کر آزاد خیال زندگی کی یہ خواہش تمہیں تمہاری ہی نظروں میں نہ گرا دے۔" نسرین بیگم نے چھاں ناگواری سے کہا۔

نسرین بیگم کی بات سن کر ثانیہ نے انہیں گھور کر دیکھا اور یک لخت پھٹ پڑی۔

"پلیز امی! آپ میری جاسوسی کرنا چھوڑ دیں۔" ثانیہ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی وجہ سے دن بدن ڈپریشن کی مریض بنتی جا رہی ہوں۔ مجھ سے پلیز دور رہا کریں تاکہ میں آزاد خیالی سے اپنی پڑھائی کر سکوں۔ اگر آج تک کسی کی ہمت نہیں ہوئی تو اب بھی کوئی میرا بال تک بیکا نہیں کر پائے گا۔"

نسرین بیگم آنسو بہاتی شکست خوردہ قدموں سے واپس لوٹ آئی۔ واپس آ کر کتنی ہی دیر تک وہ آنسو بہاتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی کسی بات کا اس کی بیٹی پر رتی برابر اثر نہیں ہونے والا لیکن وہ آنے والے حالات و واقعات سے کافی خوفزدہ تھی۔

ثانیہ اپنے والدین اور دو بھائیوں کی اکلوتی ہونے کے ناطے اس کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کی گئی تھی۔ اس کا بچپن شہزادیوں کی طرح گزرا تھا۔ وہ اپنے والدین اور بھائیوں کی بے حد لاڈلی تھی۔ سب اس کے ناز نخرے اور چاؤ چاچلوں کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اس بے جا لاڈ پیار کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ انتہائی خودسر اور بدتمیز بن گئی۔ اس کے سامنے ماں باپ بھائی اور کوئی بھی کچھ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ وہ خود کو کسی اور ہی دیس کی اپسرا سمجھنے

بڑھاپا......!

بڑھاپا کیا ہے؟ بنیادی طور پر یہ جسم کی ایک کیفیت ہے...... جسم کی موت حیات اپنی انتہا پر پہنچ جاتی ہے...... بڑھاپا جسمانی اور ذہنی انحطاط دور ہے۔ یہ رگوں، فکری پیمانوں، خون اور دماغ کے سکڑنے کی حالت ہے...... ایک انسان اتنا ہی زندہ ہے، جتنی کہ اس کی رگیں اور اتنا ہی جوان ہے، جتنے اس کے خیالات۔

بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ سیکھنے کی صلاحیت کم ہوتی جاتی ہے...... دماغ اپنے لئے ایسے خانے بنا لیتا ہے جو نئے اور نادر واقعات کو قبول نہیں کرتے اور حافظہ ناتواں ہو جاتا ہے۔ جس طرح بچے جلدی پھلتا پھولتا ہے اسی طرح بوڑھا بھی روز بروز مرجھاتا رہتا ہے...... اور جس طرح بچے میں حس کم ہوتی ہے، اسی طرح بوڑھا بھی کم حساس ہو جاتا ہے۔

حتیٰ کہ اس میں آگہی اور شعور بالکل ختم ہو جاتے ہیں تاکہ موت اپنا عمل اچھی طرح کر سکے...... جوں جوں حواس مدھم پڑتے ہیں توانائی بھی گھٹتی رہتی ہے، موت کے خوف کے ساتھ آرام اور سکون کی خواہش مل جاتی ہے اور اگر انسان نے یہ زندگی بھرپور طریقے سے گزاری تو پھر وہ اطمینان سے جان دے دیتا ہے کہ شاید اس زندگی کے ہنگامہ میں مجھ سے بہتر لوگ میری جگہ لے لیں

ول ڈیورانٹ کی کتاب "نشاط فلسفہ" سے اقتباس

(ایس امتیاز احمد...... کراچی)

گئی تھی۔ خواہشوں کی اسیر ثانیہ کے قدم زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ لیکن وہ اس بات سے قطعی آشنا نہ تھی کہ خواہشیں انسان کو ذلیل و خوار کر کے رکھ دیتی ہیں۔

دولت کی ریل پیل اور لاڈ پیار میں بچپن کا سہانا دور یونہی گزر گیا اور ثانیہ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی کالج میں داخلہ لے لیا۔ کالج میں کئی امیر ترین لڑکیوں کا اپنی من پسند اور آزاد خیال زندگی گزارتے دیکھ کر اس کے من میں بھی یہی بات بیٹھ گئی کہ وہ بھی آزاد خیال زندگی ہی گزارے گی۔ اس خواہش کے پیش نظر اس نے کئی امیر ترین لڑکیوں بلکہ چند لڑکوں سے بھی دوستی کر لی تھی۔

سردیوں کی چھٹیاں قریب آ رہی تھیں۔ چھٹیوں کے دنوں میں ثانیہ اپنے تمام دوستوں سے نیا دوست نیا دور قربت حاصل کرنا چاہتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ایک روز وہ بڑے لاڈ سے اپنے باپ کے گلے میں بازو ڈال کر بولی:

"پلیز بابا مجھے موبائل فون لا کر دیں۔ میری تمام فرینڈز کے پاس موبائل ہے۔ صرف آپ کی بیٹی کے پاس موبائل فون نہیں ہے۔"

ثانیہ اس کی اس ادا پر وحید صاحب مسکرا دیے۔

وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی فرمائش اسی طرح کرتی تھی کہ وحید صاحب انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اور اس روز بھی وحید صاحب نے اس سے اگلے دن تک موبائل فون لا کر دینے کا وعدہ کیا تو ثانیہ کے من میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ کتنی دیر تک اپنے باپ سے لاڈ پیار کرتی رہی۔ پھر خوشی سے جھومتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی اور ٹی وی آن کر کے اپنا پسندیدہ پروگرام دیکھنے لگی۔

ہمیشہ کی طرح ثانیہ ثانیہ کی خواہش پوری کی گئی تھی

دوسرے دن اس کو جدید ماڈل کا فون دیا گیا۔ پھر تو وہ سارا سارا دن فون پر مصروف رہنے لگی۔ نسرین بیگم کے احتجاج کے باوجود بھی اس کی موبائل کی مصروفیات میں کمی واقع نہ ہوئی۔ گزرتے وقت کے ساتھ وہ بغیر ڈر و خوف کے کالج کے دوست لڑکوں سے بھی موبائل فون پر بے تکلف باتیں کرنے لگی۔

ثانیہ کی ہارون نامی کلاس فیلو کے ساتھ دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ ہر گزرتے دن ان کی دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں ان کی دوستی کے چرچے کالج میں ہر ایک کی زبان پر تھے۔ ہر کوئی اس تعلق پر اپنی سوچ و بچار کے مطابق تبصرہ کرتا تھا۔ لیکن ثانیہ کو اس بات کی قطعاً کوئی چنتا نہ تھی۔

وہ ایک پر لطف دن تھا۔ اس روز موسم بہت سہانا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ ثانیہ پارک میں بیٹھی پر لطف لمحے محظوظ کر رہی تھی کہ اسے ہارون اور اعجاز اپنی جانب آتے دکھائی دیے۔

"ثانیہ تم یہاں بیٹھی ہو اور ہم سمجھے تم کالج ہی نہیں آئی؟" اعجاز نے کہا۔

"کیا بات ہے ثانیہ تم آج کل مجھ سے کافی دور دور رہنے لگی ہو؟" ہارون نے سوال داغا۔

جواباً ثانیہ مسکرا دی۔

"ارے بھئی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس موسم خوشگوار تھا اس لیے پارک میں چلی آئی اور تم سے بھلا خفا کیوں ہونا ہے؟" ایک وقت میں ثانیہ نے دونوں کے سوالوں کا جواب دے ڈالا۔

"پھر کیوں نہ اس سہانے موسم سے لطف اندوز ہوا

جائے؟" اعجاز نے چہکتے ہوئے مشورہ دیا۔

"سچ بھی آج تو سمندر کی نرم اور ٹھنڈی ریت پر قدم بقدم چلیں گے تو بہت سے لوگوں کی حسرتوں بھری نگاہوں کا مرکز ہوں گے۔" ہارون نے کہا جبکہ ثانیہ ان دونوں کی باتوں سے فقط لطف اٹھا رہی تھی۔

"واقعی یار بہت ہی مزہ آئے گا۔ خوب انجوائے کریں گے۔" اعجاز نے ہارون کی تائید کی تو ثانیہ خوشی سے کھل اٹھی۔

ثانیہ نے کچھ سوچے سمجھے بغیر ان کے ساتھ تنہا جانے کی حامی بھر لی اور پھر وہ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر گاڑی میں بیٹھے۔ چند لمحوں بعد وہ سمندر کے کنارے آ رکے۔ خوب انجوائے کیا۔ کئی لمحے موج مستی کی نذر کیے۔ ثانیہ اور ہارون سمندر کے کنارے بیٹھے تھے۔ جبکہ اعجاز آئس کریم لیکر آ گیا۔

پھر وہ تینوں گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی روڈ پر دوڑا دی۔ ثانیہ جیسے ہی آئس کریم کھانے لگی اور کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ پھر وہ وہی پہ بے ہوش ہو گئی۔ اس کو کچھ پتا بھی نہ چلا کہ اس کے ساتھ کیا سانحہ گزر گیا۔

دوسری طرف نسرین بیگم بے چینی اور اضطراب سے لمحہ بہ لمحہ انداز سے کٹ رہی تھی۔ ہر گزرتے لمحے اس کی بے قراری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے انہونے اندیشوں نے گھیر لیا۔ جانے کتنی بار اس نے ثانیہ کا نمبر ڈائل کیا مگر مسلسل بند جا رہا تھا۔ اسے ایک عجیب سا ڈر تھا۔ وہ ہر لمحہ انگاروں پر چلتے ہوئے کاٹ رہی تھی۔

جب وحید صاحب اور ان کے بیٹے گھر آئے اور ثانیہ کی کمی محسوس کی۔ تب نسرین بیگم نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ وہ اپنی فرینڈ کے گھر گئی ہوئی ہے۔ مگر اس کا دل پارہ پارہ ہو رہا تھا۔

جب ثانیہ کو ہوش آیا تو اس وقت غالباً شام کے کے سائے پر پھیلانے لگے تھے۔ دن بھر کا تھکا ہوا سورج سفر طے طے کر کے کی آخری منزل پر تھا۔ ثانیہ کے اوسان بحال ہوتے ہی اس کا پورا وجود دکھ رہا تھا اور سر بہت بھاری لگنے لگا تھا۔

تب اسے احساس ہوا کہ وہ بری طرح سے کٹ کر چور چور ہو چکی ہے۔ وہ بدحواسی کے عالم میں زور زور سے چلانے لگی۔ اس کی کیفیت بالکل پاگلوں کی سی ہو چلی تھی۔ وہ بری طرح سے چلا رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر روئے جا رہی تھی۔

صدمے سے اس کا دل پھٹ رہا تھا۔ دوسرے لمحے غم و غصے سے اس کا ذہن سلگ اٹھا وہ شدید غصے میں ہارون کی طرف بڑھی اور اس کا گریبان پکڑ کر بولی:

"دھوکے باز۔۔۔۔۔ذلیل۔۔۔۔۔کمینے۔۔۔۔۔میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ مجھے کس جرم کی سزا دی۔"

"تم جیسی آزاد خیال اور بے فکر لڑکیوں کی یہی سزا ہونی چاہیے۔" ہارون نے ہنستے ہوئے کہا تو ثانیہ کو یوں لگا جیسے اس کے پیروں تلے زمین سرک گئی ہو۔

ہارون نے اس پر یہ احساس کر دیا کہ اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر گھر سے کچھ فاصلے پر اس کی زندہ لاش کو چھوڑ کر فو ہو گیا رو ہو گیا۔

ثانیہ اردگرد کے ماحول سے بے نیاز مرے ہوئے قدموں سے اپنے گھر کی جانب چلی جا رہی تھی۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دیوانہ وار دستک دی۔ نسرین بیگم نے دوڑتے ہوئے دروازہ کھولا۔ سامنے ثانیہ کھڑی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کانٹوں بدن میں لہولہان۔ پر پر چادر نہ دوپٹہ

بال بکھرے ہوئے اور اس کے چہرے پر جگہ جگہ ہاتھوں کے نشان تھے۔ ہوش وخرد سے بیگانہ ہوئے جا رہی تھی۔

"ثانیہ۔۔۔۔ثانیہ۔۔۔۔یہ سب کیا ہے؟" نسرین بیگم نے بے قراری سے پوچھا۔

الفاظ نسرین بیگم کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ نسرین بیگم نے سرعت سے ثانیہ کو گھر کے اندر کر کے دروازے کو لاک کر دیا۔ پھر وہ ثانیہ کو سہارا دے کر اس کے کمرے تک لے آئی۔ نسرین بیگم سمجھ چکی تھی کہ اس کی بیٹی کی پاکی اور معصومیت درندگی کی نذر ہو چکی تھی۔ وہ اپنی بیٹی سے لپٹ کر خوب روئی۔ اس سے ثانیہ کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ بلند آواز میں رونے لگی جبکہ ثانیہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنی ماں کو روتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

نسرین بیگم نے ثانیہ کو آرام دہ گولیاں دی۔ اس نے ماں کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر پیا اور پھر دوبارہ بیڈ پر لیٹ گئی۔ یوں وہ گئی روز خاموشی سے بستر پر لیٹی رہی۔ اس کی نگاہیں چھت پر کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز رہتیں۔ یہی خاموشی اس نے مکمل طور پر اپنا لی۔ دنیا سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اس نے کالج کی تعلیم خیرآباد کہہ دیا۔

ہر وقت چپ چاپ اداس رہنے لگی۔ نسرین بیگم نے دوبارہ اسے زندگی کی طرف راغب کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ثانیہ کی خاموشی نے نسرین بیگم کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ثانیہ ہر وقت دیواروں کو یا چھت کو تکتی رہتی تھی۔

آزاد خیال زندگی بسر کرنے کی خواہش میں وہ اپنی ساری زندگی کی خوشیوں کو ملیامیٹ کر بیٹھی تھی۔

ثانیہ آزاد زندگی گزارنے کی خواہش میں اپنی عصمت کا جنازہ نکلوا کر موت کے انتظار میں اپنی زندگی کے دنوں کی گنتی کر رہی ہے۔ وہ روز جیتی اور روز ہی مرتی ہے۔

آخر اس کی بربادی کا ذمہ دار کون ہے۔۔۔۔؟

وہ جو آزاد زندگی گزارنے کی خواہش مند تھی یا۔۔۔۔؟

یا پھر اس کے والدین جنہوں نے شروع سے اس کی آزادی کو ایک حد تک کنٹرول نہیں رکھا تھا۔۔۔۔؟

ختم شد

☆۔۔۔۔☆۔۔۔۔☆

مور شاہد حسین
وفا الحسینی ہاؤس نزد درگاہ سید نظر حسین شاہ بخاری قمیر شہداد کوٹ
0301-2868143

عید کے حوالے سے

عید انعام خداوندی ہے۔

عید کا دن یوم رحمت ہے۔

عید نام ہے ملن کا، خوشیوں کا، نیک جذبوں کا

عید ایک پیغام ہے۔

کسی کی خوشیوں میں شریک ہونے کا

کسی کو خوشیوں میں شریک کرنے کا

جو خوشی کسی کو خوش کر کے ہوتی ہے۔

وہ اکیلے خوش رہنے سے کبھی حاصل نہیں ہوتی

اسی کا نام ہمدردی ہے۔

یہی انسانیت کی معراج اور اسلام کا درس ہے۔

(ساحل ابڑو۔ ڈیرہ اللہ یار۔ بلوچستان)

کہانیوں سے متعلق معلومات کے لیے صرف ایڈیٹر سے رجوع کریں۔



نمائندہ خصوصی اظہر اقبال مُغل کا پاکستانی مشہور ماڈل و ایکٹرس ایسہ جہان سے خصوصی انٹرویو گفتگو

نمائندہ: السلام وعلیکم!

ایسہ: وعلیکم السلام!

نمائندہ: کیا حال ہے، کیسی ہو آپ؟

ایسہ: جی ٹھیک آپ بتائیں کیسی لگ رہی ہوں۔

نمائندہ: جی سچ پوچھیں تو بہت ہی اچھی لگ رہی ہیں آپ اور بہت معصومیت ہے آپ کے چہرے پر۔

ایسہ: ہاہاہا جی بہت شکریہ۔

س: آپ نے اپنے کیریئر کا آغاز کب اور کہاں سے شروع کیا؟

ج: میں نے اپنے کیریئر کا آغاز ماڈلنگ کے فیشن شوٹ سے کیا۔

س: آپ نے اس فیلڈ ہی میں آنا پسند کیوں کیا؟

ج: میرا بچپن سے ہی شوق تھا اس فیلڈ میں آنے کا، مجھے ماڈلنگ اور ایکٹنگ کا شوق بچپن سے ہی تھا

س: آپ کو کھانے میں کیا پسند ہے؟

ج: مجھے کھانے میں پیزا بہت پسند ہے، بچپن سے ہی۔

س: کوکنگ آتی ہے آپ کو کیا اچھا بنا سکتی ہیں؟

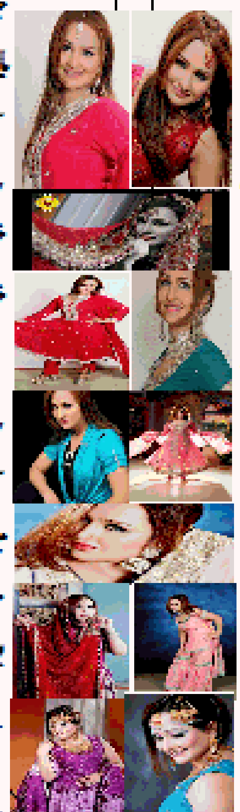
ج: جی ہاں مجھے کوکنگ آتی ہے میں بریانی بہت اچھی بناتی ہوں

س: اگر آپ ایکٹرس نہ ہوتی تو کیا ہوتی؟

ج: مجھے ایکٹنگ کا ہی شوق ہے میں ایکٹرس ہی ہوتی۔

س: آج کل جو کام ہو رہا ہے اس میں کوئی تبدیلی آنی چاہیے؟

ج: پاکستانی فلموں میں بہت اچھا کام ہو رہا ہے لیکن سٹوری کو بہت کم اہمیت ملتی ہے جس کی وجہ سے فلم انڈسٹری فلاپ ہو رہی ہے اور یہی حال ڈراموں کا ہے اور نئے چہروں کو چانس دینا چاہیے کیوں کہ لوگ ایک ہی طرح کے چہرے بار بار دیکھ کر بیزار ہو چکے ہیں کچھ نیا دیکھنا چاہتے ہیں



س: کوئی ایسی خواہش جو پوری نہیں ہو سکی؟

ج: میں پاکستان میں اپنا نام بنانا چاہتی ہوں یہ خواہش ہے اور زرداری صاحب سے ملنے کی خواہش ہے

س: آپ اپنے کام سے مطمئن ہیں؟

ج: جی ہاں میں اپنے کام سے مطمئن ہوں۔

س: مستقبل میں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟

میری خواہش ہے کہ میں فلموں میں کام کروں اور جلد لوگ مجھے ہیروئن کے روپ میں دیکھیں مجھے یقین ہے کہ جلد میری یہ خواہش پوری ہونے والی ہے۔

س: اگر انڈیا جا کر کام کرنے کا موقع ملا تو کریں گی؟

ج: ہاں جی ضرور کروں گی اگر موقع ملا تو۔

س: فلم میں کام کی آفر ہو تو کریں گی؟

ج: جی جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ فلم میں کام کرنا میرا شوق ہے۔

س: کس پاکستانی ہیرو کے ساتھ کام کرنا پسند کریں گی؟

ج: سب ہی اچھے ہیں۔

س: کوئی ایسا لمحہ جو کہ آپ کیلئے خوشی کا لمحہ ہو؟

ج: جب میں نے پہلا میگزین شوٹ کیا تھا اور میری فوٹو ہر فوٹو سٹوڈیو اور ہر بیوٹی پارلر پر لگی نظر آتی وہ لمحہ بہت خوشی کا تھا۔

س: شادی کب کر رہی ہیں؟

ج: شادی کا تو فی حال کوئی ارادہ نہیں۔

س: کس شخصیت سے بہت متاثر ہیں؟

ج: جی شیخ رشید صاحب سے بہت متاثر ہوں جنہوں ساری زندگی بغیر شادی کے گزار دی۔

س: آپ کو وزیر اعظم بنا دیا جائے تو پہلا کام کیا کریں گے؟

ج: ویری سوری مجھے کوئی شوق نہیں وزیر اعظم بنے کا اس لیئے نو کمنٹس۔

س: پاکستانی عوام کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

ج: میرا پاکستانی قوم کیلئے پیغام ہے، کہ خوش رہئیے اور دوسروں کی خوشیوں کا بھی خیال رکھیں ہمیں مسلمان ہونے پر فخر ہے پاکستانی ہونے پر فخر ہے پاکستان زندہ باد۔

نمائندہ: ایمہ آپ کا بہت شکریہ آپ نے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت ہمارے لیئے نکالا……!

ایمہ: جی آپ کا بھی شکریہ آپ لوگوں نے مجھے عزت دی۔

☆……☆……☆

معلومات

☆---قرآن میں لفظ محمد ﷺ 4 بار آیا ہے۔

☆---قرآن میں کل 114 سورتیں ہیں۔

☆---جہنم کے داروغہ کا نام مالک ہے۔

☆---جنت کے داروغہ کا نام رضوان ہے۔

☆---قرآن میں سب سے زیادہ ذکر حضرت موسیٰ کا آیا ہے۔

روبینہ ناز---کراچی

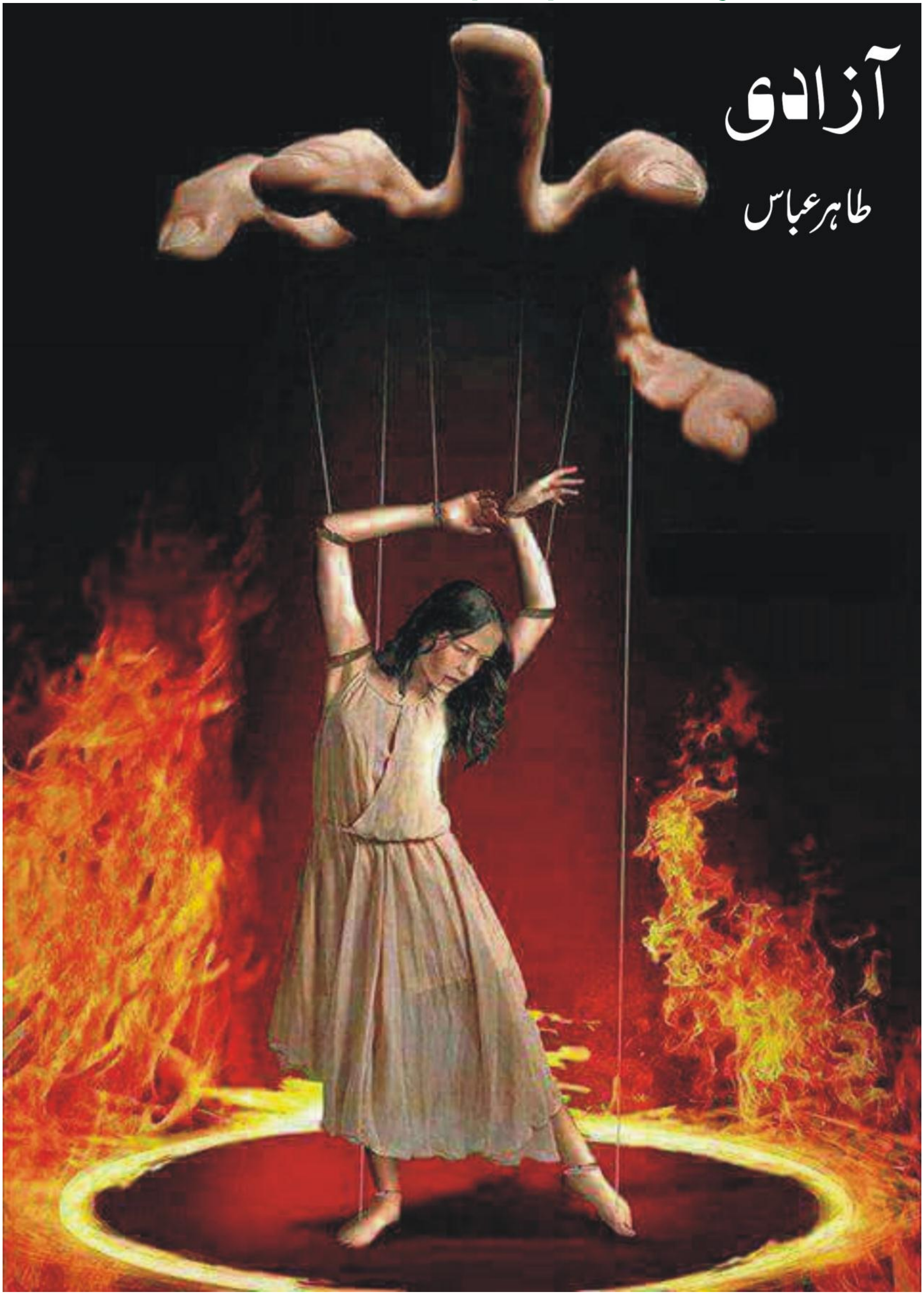
قرآن مجید میں کس چیز کا حل نہیں!

خلیفہ بغداد ہارون رشیدؒ کے درباری حکیموں میں ایک نصرانی طبیب تھا۔ جو بادشاہ کا بہت ہی معتمد اور منہ چڑھا تھا۔ ایک دن اس نے بھرے دربار ایک جید عالم علی بن حسین بن واقد سے یہ کہا کہ تمہاری کتاب قرآن شریف میں علم طب کا کہیں کوئی ذکر نہیں حالانکہ تمام علوم میں سب سے زیادہ ممتاز اور بلند مرتبہ دو ہی علم ہیں۔ ایک ہے علم الادیان۔ دوسرے علم الابدان۔ علی بن حسین نے اس کے جواب میں برجستہ فرمایا کہ "تمہیں کیا خبر؟ کہ پورا علم طب خدا وند قدوس نے قرآن مجید کی صرف آدھی آیت میں جمع فرما دیا ہے۔"

نصرانی طبیب نے حیران ہو کر پوچھا کہ "بتاؤ وہ کون سی آیت ہے؟" علی بن حسین نے فرمایا کہ "کھاؤ پیو اور حد سے نہ بڑھو" یہ سن کر طبیب حیران رہ گیا پھر کہنے لگا کہ "پیغمبر اسلام نے بھی اصول طب کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایا ہے؟" علی بن حسین نے فرمایا کہ "ہمارے پیغمبر ﷺ نے تو بہت کچھ ارشاد فرمایا ہے مگر تم اس وقت صرف ایک حدیث سنو۔ معدہ تمام امراض کی جڑ ہے اور پرہیز تمام دواؤں کا سردار ہے اور اپنے جسم سے وہی کام لو جس کا وہ عادی ہے۔" یہ سن کر نصرانی طبیب فرط حیرت سے علی بن حسین کا منہ تکنے لگا اور کہا "تمہاری کتاب اور تمہارے نبی ﷺ نے تو "جالینوس" کے لئے کوئی طب چھوڑی ہی نہیں۔"

بحوالہ روحانی حکایات از علامہ عبد المصطفی

سیدہ ردا زینب بخاری


آزادی
طاہر عباس

آزادی

طاہر عباس-----شجاع آباد

0303-8415079

دوپہر کا وقت تھا۔سورج سوا نیزے پر قیامت برپا کر رہا تھا۔شدت کی گرمی تھی آگ برساتے سورج کے نیچے ایک گھر کے سامنے تین چار سالہ بچہ رو رہا تھا۔اس کے سامنے اس کے ماں باپ کی گولیوں سے چھلنی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔بچہ بھوک و پیاس کی شدت سے ہلکان ہوئے جا رہا تھا۔وہ بار بار اپنے معصوم ہاتھوں سے اپنے والدین کی لاشوں کو ہلا کر انہیں متوجہ کرنے کی ناکام سعی کر رہا تھا لیکن وہ اس بات سے قطعی ناآشنا تھا کہ اب اس کے والدین کبھی نہ اٹھنے کی جسارت نہیں رکھتے تھے۔

ظلم کی انتہا یہ تھی کہ آس پاس کے گھروں سے بھی کوئی اس بچے پر ترس کھا کر باہر نہیں نکلا تھا۔ہر کوئی اپنی جان بچانے کے لیے کمروں میں گھسا ہوا تھا۔سب کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔بچہ پیہم رو رہا تھا۔بچہ روتا بلکتا رہا لیکن کوئی بھی اس کی مدد کے لیے نہ آیا حتیٰ کہ اس بچے نے بھی اسی حالت میں جان دے دی۔

☆-----☆-----☆

ہر طرف رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔جگہ جگہ خون بکھرا ہوا تھا۔کئی لوگ اپنے عزیزوں کی لاشوں کے سامنے بیٹھے تھے۔ان کی آنکھیں ساون کی جھری کی مانند برس رہی تھیں۔ان کے سامنے ان کے ماں، باپ، بہن، بھائی اور عزیزوں کی گولیوں سے چھلنی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ایک جگہ ایک دس بارہ سال کا بچہ اپنی ماں اور بہن کی لاش کے سامنے بیٹھ کر رو رہا تھا۔اس کے باپ کو کچھ ماہ پہلے ابدی نیند سلا دیا گیا تھا۔وہ کبھی اپنی ماں اور بہن کی لاشوں کی طرف دیکھ کر روتا تو کبھی آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر رونا شروع کر دیتا اور کہتا کہ:

"یا اللہ! ہمیں اس ظلم سے بچا لے-----ظالموں کے چنگل سے نکال اور ہمیں آزادی نصیب فرما۔"

☆-----☆-----☆

ہر طرف خوف کی پرچھائیاں سایہ فگن تھیں۔فضا میں خون کی بو پھیلی ہوئی تھی۔یہ کشمیر، شام، فلسطین وغیرہ کی ریاستیں تھیں۔وہاں کے لوگوں نے مسلمانوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔فوجی آتے اور جو بھی انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی عبادت و اطاعت میں مصروف دکھائی دیتا یا جس کے بارے میں انہیں شبہ بھی ہو جاتا اسے فی الفور ابدی نیند سلا دیتے۔

ان کے مظالم یہیں رکے نہیں تھے بلکہ دن بدن ان میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔جب ان کا دل کرتا آ جاتے اور جو بھی مسلمان ان کے سامنے آتا اسے فوری طور پر شہید کر دیتے۔

وہاں کے مظلوم مسلمان بے چارے خوف سے گھروں میں دبک کر رہ گئے۔ان کے معمولاتِ زندگی یکسر خراب ہو کر رہ گئے۔ان کے کاروبار ٹھپ ہو گئے اور کچھ مقامی باشندوں نے قبضے جما لیے تھے۔جو بھی ان کے خلاف آواز اٹھانے کی سعی کرتا اسے فوراً سے بھی پیشتر ابدی نیند سلا دیا جاتا۔

اتنا کچھ سہنے کے باوجود بھی انہیں خالقِ حقیقی سے امید کامل تھی کہ ایک دن آزادی انہیں ضرور ملے گی۔ان کی امیدیں صرف اللہ اور اس کے پیارے حبیب ﷺ پر کامل

تھیں۔

یہی نہیں ان کی نظریں آزاد مسلم ممالک پر مرکوز تھیں کہ وہ ضرور ان کے لیے کچھ کریں گے لیکن ابھی تک ان کی مدد کے لیے کسی بھی ملک کی طرف سے کوئی پیش رفت نہ ہوئی تھی۔تاریخ گواہ ہے کہ جیت ہمیشہ حق سچ کی ہی ہوتی آئی ہے۔لیکن اب تو ایسا لگ رہا تھا کہ باطل حق پر مسلط ہونے والا تھا۔غیر مسلم مسلمانوں پر بھاری پڑ رہے تھے۔اور یہ مسلمانوں کا اپنا قصور تھا۔وہ خود اس کے ذمہ دار بھی تھے۔

☆-----☆-----☆

ماجد صوفے پر پڑا ہوا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ٹی وی پر بتایا جا رہا تھا کہ پشاور میں ایک سکول میں حادثہ ہو گیا تھا۔اور اس میں سینکڑوں معصوم بچے شہید کر دیے گئے تھے۔یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔جس نے پوری دنیا کو ہی ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ماجد سوچنے لگا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

جو مسلمان آزاد نہیں ہیں۔ان پر کافر ظلم ڈھا رہے ہیں۔اور جو آزاد ہیں۔ان پر اپنے ہی ملک کے مسلمان ایک دوسرے کو ختم کر رہے ہیں۔حالات اتنے گھمبیر ہوتے جا رہے تھے کہ بیرونی قوتوں کے غالب ہونے کے امکانات مترشح تھے۔اس کی چھٹی حس اسے آنے والے حالات سے متنبہ کر رہی تھی۔

☆-----☆-----☆

دن گزرتے گئے۔آئے دن کوئی نہ کوئی واقع ہو جاتا۔

ایک دن ماجد اپنے دادا جان کے کمرے میں پہنچا تو وہاں اپنے بڑے بھائی خالد کو بھی پایا۔

ماجد نے جا کر سلام کیا اور کہا" آزادی مبارک۔"

"خیر مبارک۔" اس کے بھائی اور دادا دونوں یک زبان ہو کر بولے۔

ماجد ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔اس نے دادا کی طرف دیکھا تو حیران و ششدر رہ گیا کیونکہ دادا کی آنکھوں سے پیہم آنسو چھلک رہے تھے۔

"دادا جان آپ رو کیوں رہے ہیں؟" ماجد نے حیرت کے سمندر میں غرق ہو کر پوچھا۔

"کیا کوئی مسئلہ پیش آیا ہے یا گھر میں کسی نے کچھ کہا ہے؟"

اس کے دادا کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے:

"اس آزادی کا کیا فائدہ۔آج ہم تو آزادی کی خوشیاں منا رہے ہیں لیکن کبھی ان کے بارے میں سوچا ہے جو غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔وہ نہ تو کھل کر اللہ تعالیٰ عزوجل کی عبادت کر سکتے ہیں اور نہ سکون سے اپنی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔"

"لیکن دادا جان ہم ان کے لیے دعا تو کر سکتے ہیں؟" ماجد نے پوچھا۔

"کیا صرف دعائیں ہی کافی نہیں ہیں۔" دادا جان بولے۔

"آزاد مسلم ممالک کو یکجا ہو کر ایک لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے اور دشمن ممالک کے خلاف آواز حق اٹھانی چاہیے۔ہمیں ان کے خلاف جنگ لڑنی چاہیے۔ہم لوگ مسلمان ہیں اور مسلمان پر جہاد فرض ہے۔ہم سیاسی جلسوں اور فضول قسم کی بیٹھکوں میں ضرور شرکت کرتے ہیں لیکن حق کے خلاف آج تک نہ تو کسی نے کوئی جلسہ جلوس نکالا اور نہ ہی کوئی لائحہ عمل

تیار کیا۔"

"دادا جان کیا ہم اکیلے بھی ان کے خلاف یہ سب کچھ کر سکتے ہیں؟" اب کی بار خالد نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ اگر چند بندے تیار ہو جائیں اور آواز بلند اٹھائیں تو دیکھا دیکھی میں لوگ ساتھ ملنے لگیں گے اور پلک جھپکنے میں لوگوں کا جم غفیر پیدا ہو جائے گا۔"

قبل اس کے کہ کوئی بولتا کمرے کا دروازہ کھلا۔ سب نے اس طرف دیکھا۔ ماجد کا دوست ظفر کمرے میں داخل ہوا۔

"السلام علیکم.....!" ظفر نے سب کو مخاطب کر کے سلام پیش کیا۔

"وعلیکم السلام.....!" جواباً سب نے سلام کا جواب دیا۔

"میں آ گیا۔" ظفر ایک طرف رکھی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم لوگوں نے کہا تھا کہ گھر کو سجانا ہے۔"

سب دادا جان سے اجازت لے کر کمرے سے باہر نکل آئے اور گھر کو سجانے لگے۔ رنگ برنگ جھنڈیوں، پاکستان جھنڈے اور لائیٹوں سے گھر کو سجا دیا گیا تھا۔

دوسرے دن ماجد نماز پڑھنے گیا تو مولوی صاحب نے نماز کے بعد تقریر کرتے ہوئے جہاد کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ:

"اے مسلمانوں! تمہیں کیا ہو گیا ہے اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے آواز حق بلند کیوں نہیں کرتے۔ کیا تمہارے خون سفید ہو چکے ہیں یا پھر احساس کی کمی کا شکار ہو۔"

پھر مولوی صاحب نے ایک واقعہ سنانا شروع کر دیا اور بولے:

"جب حضور پاک ﷺ کے زمانے میں جنگ ہو رہی تھی۔ کئی صحابہ کرامؓ زخمی حالت میں پڑے تھے۔ ایک صحابیؓ سب کو پانی پلا رہا تھا۔ ایک طرف سے پانی مانگنے کی آواز آتی تو وہ بھاگتا ہوا وہاں پہنچا اور اس صحابیؓ کو پانی کا گلاس بھر کر دیا۔

اس صحابیؓ نے ابھی پانی کا گلاس پکڑا ہی تھا کہ دوسری طرف سے کسی صحابیؓ کے پانی مانگنے کی آواز سنائی دی تو پہلے صحابیؓ نے گلاس واپس پانی پلانے والے صحابیؓ کو دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"میرے مسلمان بھائی کو پہلے پانی پلاؤ۔"

پانی پلانے والا صحابیؓ اس صحابیؓ کے پاس گئے تو اتنی دیر میں وہ صحابیؓ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے تھے۔ وہ پہلے والے صحابیؓ کو بچانے کے لیے اس کے پاس آئے لیکن وہ بھی خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔"

یہ واقعہ سن کر ماجد مسجد سے باہر نکل آیا اور سوچنے لگا کہ وہ وقت کتنا عظیم وقت تھا۔ جب حالت نزاع میں بھی لوگوں کو دوسروں کا خیال تھا اور آج لوگ دوسروں کا حق کھانے میں بھی ذرا دریغ نہیں کرتے۔

ماجد سیدھا اپنے دادا کے کمرے میں آیا۔ اسے دیکھ کر خالد بھی آ گیا۔ ماجد نے دادا کو سلام کیا اور باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو دادا کہنے لگا کہ:

"بیٹا اکیلے نہیں ہیں۔ ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ عزوجل کی پاک ذات ہے۔ جیت ہمیشہ حق کی ہی ہوتی ہے۔ ہمیں تو بس اللہ پر یقین کامل رکھنا چاہیے۔ مایوسی گناہ ہے۔ آج جو کچھ بھی ہے ایک امید پر ہی تو ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ایجاد بھی کئی کئی سال کی محنت پر مبنی ہوتی ہے۔ انسان نے بے بہا چیزیں ایجاد کیں لیکن یہاں آ کر اس نے ہمت ہاری نہیں

بلکہ اس کے جذبے مزید مستحکم ہوئے اور اس نے ایجادات کے لیے مزید پر تولنے شروع کر دیے ہیں۔

ایک وقت تھا جب ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ نے اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کے اندر آزادی کے جذبات ابھارے تھے۔ انہیں حقیقی تشخص سے روشناس کروایا تھا۔ دوسری طرف قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے دن رات محنت کر کے ایک آزاد وطن کے خیال کو حقیقت کا روپ دیا تھا۔

لاکھوں مسلمانوں کو آزادی کی خاطر اپنی تن من دھن کی قربانی دینی پڑی تھی۔ لیکن ان کی نسلیں آج آزادی سے جی رہی ہیں۔ پاکستان کی بنیاد اسلام پر رکھی گئی تھی تا کہ مسلمان مکمل آزادی سے جی سکیں۔ آئین اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بنائے گئے تھے۔

لیکن صد افسوس! آج وہی مسلمان مغربی تعلیم کو اپنانے کے لیے پر تول رہا ہے۔ ملک کے اندر مغربی تعلیم کو رائج کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ اسلامی تعلیمات کو درس و تدریس سے ختم کیا جا رہا ہے۔ ہمارے حکمران مغربی ممالک کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے ہیں۔

یہ وہی ملک ہے۔ جسے حاصل کرنے کے لیے قائد اعظم نے دن رات محنت کی تھی۔ انہیں خریدنے کی ہر ممکن سعی کی گئی تھی لیکن وہ کسی سے بھی نہیں خریدے گئے تھے۔ اور آج سب کچھ اس کے متضاد ہے۔ آج ہماری حکومت انڈیا اور انگریز کے حکم پر چل رہی ہے۔ ایسے حالات میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی مرد مومن نکلتا ہے۔ جس کا جگر حضرت خالد بن ولیدؓ کی طرح ہوتا ہے۔ اسے موت کی چنتا نہیں ہوتی بلکہ اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کی دھن اس پر سوار ہوتی ہے۔

بس میں اور کیا کہہ سکتا ہوں میرے بیٹوں۔ حالات کافی گھمبیر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس ملک میں بھی بیرونی قوتیں حاوی ہوتی جا رہی ہیں۔ آنے والے حالات قیامت کی نشانیاں مزید عیاں کر رہے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ عزوجل کی پکڑ سب کو آن پکڑے گی اور تب سب کہیں گے کہ ہم غلطی پر تھے اور خسارے میں آن ڈوبے ہیں۔"

اتنا کہہ کر دادا جان چپ کر گئے۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد دونوں بھائی اٹھ کر باہر نکل گئے۔

☆-----☆-----☆

ظلم کے سائے آج بھی مسلم ممالک پر سایہ فگن ہیں۔ عراق، ایران، شام، بغداد، لیبیا، فلسطین، کشمیر اور پاکستان سمیت دنیا کے تمام اسلامی ممالک میں بیرونی قوتیں انتشار پھیلانے کی ہر ممکن سعی کر رہی ہیں۔ لیکن ان سب کا ذمہ دار کون ہے؟

کیا مغربی اور بیرونی دشمن طاقتیں.....؟

مسلم قوم.....؟

یا پھر ہمارے حکمران.....؟

کتنے ہی سوالات ہیں جو ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برستے ہیں لیکن ہمارے پاس کسی ایک سوال کا بھی جواب نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم خود ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ اگر ہم حکمرانوں کی بات کریں تو حکمرانوں کو ہم لوگ ہی لے کر آتے ہیں۔ ہمارے جذبات و احساسات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ نشستوں پر براجمان ہوتے ہیں۔ اور پھر اپنا تشخص تک فراموش کر دیتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں سیدھی راہ دکھائے اور ہم پر رحم فرمائے۔ آمین۔


اللہ کے نام پہ گوشت دے دو
فضہ خان

اللہ کے نام پہ گوشت دے دو

فضہ خان----- ہری پور ہزارہ

آج بکرا عید کا پہلا دن تھا۔اور یہ دن معمول سے ہٹ کر ایک حسین دن تھا۔ہر طرف عجیب سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ موسم بھی انتہائی خوشگوار تھا آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔سب بچے عید کے نئے نئے جوڑے پہنے اپنے اپنے قربانی کے جانوروں کے ساتھ تصویریں بنانے میں مصروف تھے۔

اپنے جانوروں کی آخری بار چارہ کھلانے کے بعد خوشی اور دکھ سے ملے جلے تاثرات لئے انہیں کیمرہ گرا وینڈیا پھر اپنے گھر کے باہر ہی قربانی کے مخصوص مقام پر لئے کھڑے تھے۔نماز عید کے بعد قصائیوں نے ایک ایک کر کے تکبیر پڑھتے ہی جانوروں کی گردنوں پر چھریاں پھیرنا شروع کر دی تھیں۔کچھ بچے خون دیکھ کر سارے ڈر کے چیخنے چلانے لگتے جبکہ کچھ خاموشی سے بھولے نظارے تھے۔

عائشہ اور عمر بھی اپنے بابا رضا ہارون کے ساتھ گھر کے باہر ہی بکرہ ذبح کروانے کے بعد اس کی چمڑی ادھیڑنے اور گوشت بنانے کا منظر دیکھ رہے تھے۔

آٹھ سالہ عائشہ لال رنگ کا نیٹ کا غرارہ فراک پہنے جی بیا جو غریب ہوگا اس کو دینگے باقی خود کھائیں گے۔

"بابا میں دوں گی غریبوں کو" عائشہ نے خوشی سے چہچہاتے ہوئے کہا تھا۔

"جی ٹھیک ہے بیا اب آپ کھیلو جا کر آپ کے کپڑے خراب ہو جائیں گے"

رضا کام کے دوران مسلسل عاشی کے نہ ختم ہونے والے سوالوں سے تقریباً اکتا چکا تھا۔لہذا اس نے عاشی کا دھیان اب دوسری طرف دلانے کی کوشش کی۔

"او کے بابا میں انور ماما کے پاس چلتی ہوں"

اتنا کہہ کر عاشی عمر کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر چلی گئی۔

کچھ ہی دیر میں رضا بھی گوشت کا کام ختم کر کے گوشت سے بھرا ٹب لئے کچن میں کھڑا تھا۔جبکہ عاشی کی ماں شہلا اب گوشت کے حصے کرنے لگی تھی۔عاشی چپ چاپ سارا منظر دیکھ رہی تھی اور تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی سوال کر دیتی تھی۔

"رضا اتنا کافی ہے نہ رشتہ داروں کے لیے میں بس پیکٹ بنا لیتی ہوں پھر چلتے ہیں۔"شہلا نے گوشت کی ٹرے ہاتھ میں پکڑے رضا سے پوچھا تھا۔

جب کہ وہ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر پیچھے پلٹا تو گوشت کو دیکھتے ہی بولا:

"ارے نہیں نہیں اس کو کم کر دو۔کیا سارا رشتہ داروں میں ہی بانٹ دو گی۔سب نے قربانی کر رکھی ہے۔بس ایک رسم ہی پوری کرنی ہے۔"

"او کے کر دیتی ہوں۔"شہلا نے ٹرے واپس رکھتے ہوئے رضا کی بات پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔

ٹرے میں سے گوشت کم کرنے لگی تھی۔جبکہ رضا دوبارہ بولا:

"یہاں غریب کوئی نہیں ہے لہذا ان کے لیے پیکٹ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" شہلا نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

"مگر غریبوں کا حق تو ان کو دینا ہوتا ہے ناں۔۔۔۔؟"

شہلا نے رضا کو دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

رضا پانی پیتے ہوئے گلاس منہ سے ہٹا کر بولا:

"یہاں کون غریب ہے یار جسے میں دے کر آؤں۔ پورے ماڈل ٹاؤن میں سب نے کر رکھی ہے قربانی۔ اور ویسے بھی پچھلی بار ہم نے قربانی نہیں کی تھی تو کسی ایک نے بھی گوشت نہیں بھیجا تھا۔ یاد نہیں ہے تمہیں۔"

رضا نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے شہلا کو سوالیہ نگاہوں سے گھورا۔

"ہاں مگر ہم تو تب نئے نئے شفٹ ہوئے تھے اور کوئی ہمیں جانتا تک نہیں تھا۔" شہلا نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے مگر جان پہچان ضروری نہیں ہوتی۔۔۔۔" رضا نے کہا۔

عاشی چپ چاپ دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ جب اس کے والد نے تنگ کر جواب دیا تو وہ فوراً بول اٹھی۔

"بابا یہاں قریب میں ایک کچی بستی ہے۔ میری دوست مریم نے بتایا ہے وہاں بہت سارے غریب لوگ رہتے ہیں۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ گوشت ان میں بانٹ دیتے ہیں۔ مریم لوگ بھی وہیں دے جاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔" رضا نے کہا۔

"آپ چلو جاؤ اور کھیلو۔ آپ کو یہاں بیٹھے گوشت کی سمیل (smell) نہیں آ رہی۔"

عاشی چپ چاپ وہاں سے کھسک گئی۔

"کیا بات ہے بچی پر اتنا غصہ کیوں نکال رہے ہو؟"

شہلا نے کن انکھیوں سے رضا کو دیکھتے ہوئے چولہے پر رکھی چائے کی دیگچی اتاری۔

چائے کا کپ رضا کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے اس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے گھورا گویا وہ اس سے اپنے سوال کا جواب طلب کر رہی ہو۔

"یار صبح سے اس بکرے کے ساتھ لگا ہوا ہوں اوپر سے اس نے بول بول کر دماغ چٹ کر دیا ہے۔" رضا نے چائے کی چسکی بھرتے ہوئے کہا۔

"بہت بولنے لگی ہے اس کو اتنا مت بولنے دیا کرو۔ اس گوشت کے پیکٹ بناؤ اور فریج میں رکھ دو۔ ویسے بھی آجکل اصلی گوشت ملتا ہی کب ہے۔ پیٹ بھر رکھے ہیں ان غریبوں نے مانگ مانگ کر۔ بس ہوگئی ہے قربانی۔ اللہ قبول کرے گا۔"

شہلا کے کچھ بولنے سے قبل ہی رضا چائے کا کپ تھامے کچن سے باہر نکل گیا۔ شہلا نے اس کے حکم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے گوشت کے پیکٹ بنا کر انہیں فریج میں رکھا۔ کچھ ہی دیر میں گوشت سے فریج ٹھسا ٹھس بھر چکا تھا۔ شہلا نے گوشت کا کام ختم کرنے کے بعد ایک نظر پھر فریج کو کھول کر دیکھا اور خوش ہوتی ہوئی شاور لینے چلی گئی۔

☆۔۔۔۔☆۔۔۔۔☆

رضا ہارون کچھ سال پہلے اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک چھوٹی سی بستی میں رہتا تھا۔ اس نے اپنی گزشتہ زندگی انتہائی غربت زدہ ماحول میں ہر چھوٹی چھوٹی چیز کے لیے ترس ترس کر گزاری تھی۔ والد ریلوے کے محکمے میں ملازم تھے جبکہ والدہ سارا سارا دن لوگوں کے کپڑے سلائی کیا کرتی تھی۔۔۔۔ رضا ان کی اکلوتی اولاد تھا۔

انہوں نے اپنی عمر بھر کی جمع پونجی رضا پر لگا دی تھی۔ سکول سے کالج اور پھر کالج سے یونیورسٹی تک انہوں نے رضا کو دن رات محنت کر کے اپنا پیٹ کاٹ کے پڑھایا لکھایا تھا۔ رضا کے والد کی خواہش تھی کہ وہ رضا کو بہت اونچی پوسٹ پر دیکھیں۔ غریب زدہ زندگی انہوں نے گزاری ہے ویسی رضا کی نہ ہو۔ رضا اپنے گھریلو حالات سے اچھی طرح واقف تھا اس نے کبھی بھی کوئی فالتو خواہش نہ کی تھی۔

والد بیمار رہنے لگے تو انہوں نے اپنی زندگی میں ہی رضا کی شادی کی خواہش ظاہر کر دی تھی۔ اور جلد ہی رضا کی خالہ زاد شہلا بیاہ کر ان کے گھر آ گئی تھی۔ رضا کی شادی کے چھ ماہ بعد رضا کے والد انتقال کر گئے تھے اس کے بعد جلد ہی اللہ نے رضا کو ایک پھول سی بچی سے نوازا تھا۔ رضا کی دن رات کی انتھک محنت ماں کی دعاؤں اور عائشہ کے نصیب سے رضا مقابلے کا امتحان میں پاس ہو گیا اور پھر اے ایس کے عہدے سے منسلک ہو گیا۔

اسے سرکاری گھر اور گاڑی مل گئی تھی۔ چار سال ہو چکے تھے انہیں اس گھر میں شفٹ ہوئے جبکہ رضا کا بیٹا عمر بھی اب تین سال کا ہو چکا تھا ان چار سالوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا اور رضا تو کُلّی چینج ہو چکا تھا اس نے اب رشوت کھانا شروع کر دی تھی۔

پسماندہ طبقے سے وہ کوٹھیوں، گاڑیوں میں پہنچا تو اسے اب اونچی سے اونچی شان دکھانے اور بڑی سے بڑی گاڑی خریدنے کا چسکا لگ گیا تھا۔ دن بدن وہ ترقی کی طرف گامزن ہونے لگا تھا اپنی گزشتہ غربت زدہ زندگی وہ بالکل بھول چکا تھا اس نے اپنے دوست یار اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا یہاں تک کر اپنا ہر انداز بدل دیا تھا۔

اس دوران ایک دن اماں بھی چل بسی تھیں۔ اماں کی وفات کے کچھ دن بعد وہ لوگ ماڈل ٹاؤن سے ڈیفنس شفٹ ہو گئے تھے۔

گزشتہ سال عشنگی کی وجہ سے رضا قربانی نہ کر پایا تھا مگر اس سال وہ قربانی کے لیے پوری ڈھائی لاکھ کا بکرا لے آیا تھا۔ وہ دونوں نہا دھو کر رشتہ داروں میں گوشت تقسیم کرنے کی غرض سے جانے کے لیے تیار ہوئے تھے جبکہ بچے بھی صبح سے اسی انتظار میں تھے۔ جیسے وہ ٹی وی لاؤنج سے باہر نکلے۔ عاشی اپنے ساتھ ایک بچی کو لیے اندر چلی آ رہی تھی۔

”یہ کون ہے بیٹا......؟“ شہلا نے اس بچی کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے عاشی سے پوچھا تھا۔

مینارِ پاکستان

مینارِ پاکستان کو یادگارِ پاکستان بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً ایک سو چھیاسٹھ فٹ ہے۔ اکیس کتوبر انیس سو اڑسٹھ میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔ مینارِ پاکستان وہ تاریخی جگہ ہے جہاں آل انڈیا مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس 23 مارچ 1940 منٹو پارک میں منعقد ہوا۔ لاہور میں یادگار جلسہ عام تھا۔ اس جلسے نے برطانیہ قابض حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ بچوں کی بڑی تعداد چھٹی کے دن اس تاریخی مقام کی سیر کرنے آتے ہیں۔

23 مارچ کے موقع پر مینارِ پاکستان کو خوبصورت رنگ برنگی روشنیوں سے سجایا جاتا ہے۔

حمزہ فیروز......سلانوالی، سرگودھا

اس بچی نے گندے اور پھٹے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے اور ہاتھ میں گوشت کا تھیلا اٹھائے شہلا کو التجائیہ نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

شہلا کے پوچھتے ہی وہ بچی خود بول پڑی۔

"باجی اللہ کے نام پر گوشت دے دو اللہ تمہیں......"

ابھی اس بچی کی بات مکمل نہ ہوئی تھی کہ رضا اس بچی پر برس پڑا۔

"چلو نکلو یہاں سے......"

"اللہ کے نام پر دیدو گوشت" بچی نے دوبارہ التجائیہ انداز میں کہا۔

"اللہ کے نام پر مانگنے کے علاوہ کوئی کام کاج نہیں ہے تم لوگوں کا۔ نکالو اس کو باہر۔ آجاتے ہیں پتا نہیں کہاں کہاں سے۔" رضا انتہائی غصے سے اس بچی پر دھاڑا تھا جبکہ شہلا اسے بازو سے پکڑ کر گلی دروازے سے باہر کھڑا کر آئی۔

"بابا یہ آپ نے کیا کیا" عاشی نے نے سارا منظر دیکھنے کے بعد حیرت اور پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"وہ ایک غریب بچی تھی۔"

"نہیں وہ غریب نہیں تھی۔" رضا غصے سے چلایا اور پھر بچی کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے فوراً ٹھنڈا پڑ گیا اور اسے سمجھانے والے انداز میں بولا:

"یہ لوگ غریبی کا ڈرامہ کرتے ہیں۔ تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ ایسے گندے بچوں سے دور رہا کرو ورنہ بیماریاں لگ جائیں گی۔"

پھر رضا عاشی کو گاڑی میں بٹھا کر گھر سے باہر نکلا۔ رضا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی جبکہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر شہلا براجمان ہو گئی تھی۔ عاشی کی نگاہیں گاڑی کے شیشوں سے باہر ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ رضا نے جو بھی اسے قربانی کے متعلق بتایا تھا۔ وہ سب اس کے برعکس ہو رہا تھا۔ جو وہ اپنے گھر میں ہوتا دیکھ رہی تھی۔ نہ ہی رضا نے اس گوشت کو تین حصوں میں منقسم کیا تھا اور نہ ہی کسی رشتہ دار یا کسی غریب کو بھجوایا تھا۔ بلکہ ایک غریب لڑکی کو انہوں نے ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا تھا۔

تبھی یکبارگی عاشی کے دماغ میں اس کی دادو کی کہی بات آگئی۔

"بیٹا اگر اللہ کے نام پر کوئی بھی آپ سے کچھ مانگے تو انکار مت کرنا فوراً اسے کچھ نہ کچھ دو۔ کیونکہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب کچھ اسی کا دیا ہوا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو عطا کر کے اس کی آزمائش لیتا ہے کہ آیا میرا بندہ میرے غریب بندے کو کچھ دیتا ہے یا نہیں۔

اگر ہم اس کے بندوں میں کچھ تقسیم کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ پھر ہم پر آنے والی کتنی ہی بری بلائیں اور ناگہانی آفتیں ٹل جاتی ہیں۔ بدلے میں ہمیں اللہ تعالیٰ اپنی بے پناہ نعمتوں سے مزید نوازتا ہے۔"

تب عاشی نے دادو کی بات سننے کے بعد بلاؤں اور ناگہانی آفتوں کے بارے میں ڈیٹیل پوچھی تھی۔ عاشی کے دماغ میں مسلسل یہ باتیں چل رہی تھی جبکہ رضا نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بیک مرر میں عاشی کو چپ چاپ بیٹھے دیکھا تو اسے اپنے رویے پر چند اں افسوس ہونے لگا تھا کہ اس نے عاشی کے سامنے اس طرح کیوں برتاؤ کیا......؟

وہ بیچاری سہم سی گئی تھی۔

"عاشی بچے......آئی ایم سوری" عاشی نے رضا کی بات

سننے بعد باہر سے نظریں ہٹا کر سامنے لگے بیک مرر میں ایک نظر اپنے باپ کو دیکھا۔ اور پھر سے بغیر کچھ کہے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

"بیٹا سوری ناں۔ وہ بچی بہت گندی تھی بیٹا اور آپ نے اسے بازو سے پکڑ رکھا تھا اس لیے میں نے غصہ کر دیا۔ آپ تو جانتے ہو نہ کہ آپ کے بابا آپ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اگر آپ کو جراثیم لگ جاتے اور آپ بیمار ہو جاتی تو......؟"

عاشی نے حیرت و یاس سے ایک بار پھر بیک مرر میں دیکھا اور گویا ہوئی:

"بابا آپ نے مجھے مسلمانوں کی قربانی کے بارے میں جتنی انفارمیشن دی تھی۔ وہ سب غلط ہے۔ مسلمان تو قربانی اپنے لیے کرتے ہیں فریزر میں سیو کرنے کے لیے..... نہ غریبوں کو دیتے ہیں اور نہ ہی رشتے داروں کو۔" عاشی نے بالآخر من کی بھڑاس کو لفظوں کا جامہ پہنا دیا۔

دونوں میاں بیوی بچی کی بات سن کر ٹھٹھک گئے اور دونوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا۔

رضا کے ذہن میں وہ ساری باتیں گھومی جو وہ عائشہ کو پچھلے کئی دنوں سے قربانی کے متعلق بتاتا چلا آ رہا تھا۔ ایک لمحہ کو اسے بھی افسوس ہوا کہ وہ اپنے بچوں کو کیا سکھا رہا ہے اور خود کیا کر رہا ہے؟ اس کے الفاظ اس کے اعمال سے بالکل متضاد تھے۔ وہ اپنے بچوں کو حضرت ابراہیم ؑ سے لے کر تمام پیغمبروں کے متعلق قربانی کے بارے میں جو بتا چکا تھا۔ وہ ان سب باتوں کے برعکس ان پر عمل پیرا نہ ہو سکا تھا۔ بتانے اور کرنے میں بہت فرق تھا۔

"بیٹا وہ پرانا دور تھا۔ آج کل کے ٹائم میں ایسا نہیں ہوتا۔ جب ہر کوئی قربانی نہیں کرتا تھا۔ اب تقریباً ہر گھر میں ہوتی ہے قربانی۔" اب کی بار شہلا نے لقمہ دیا۔

"مگر امی اگر اس بچی کے گھر میں قربانی ہوئی ہوتی تو وہ ہماری طرح عید کے کپڑے پہن کر عید منا رہی ہوتی ناں..... یوں مانگ نہ رہی ہوتی اللہ کے نام پہ۔" عاشی نے جواب دیا۔

"بیٹا وہ پیشہ ور بھکاری ہوتے ہیں اللہ کے نام پر مانگتے ہیں اور لے جا کر بیچ دیتے ہیں خود نہیں کھاتے....." شہلا بولا۔

"مگر بابا دادو کہتی ہیں اگر آپ سے اللہ کے نام پر کوئی بھی کچھ مانگے تو انکار نہیں کرنا چاہیے اللہ کے نام پر دیے دینے سے بلائیں ختم ہو جاتی ہیں اور اگر نہ دو تو وبال ہوتا ہے۔" عاشی نے معصومیت سے کہا تھا جبکہ رضا اور شہلا اب دونوں ہی لاجواب ہو چکے تھے لہٰذا چپ چاپ باہر دیکھنے لگے۔

جبکہ عاشی نے ایک ایک نظر ماں باپ دونوں کو دیکھا اور پھر وہ بھی باہر دیکھنے لگ گئی۔

"رضا بیکری کے پاس روکیے گا اچھا سا کیک لے لوں ان کے لیے۔ عید کا دن ہے خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگتا۔" شہلا بولی تو رضا نے گاڑی سائیڈ پر کرتے ہوئے بریک لگائی۔

"لو جی آ گئی بیکری۔" رضا نے گاڑی پارک کرنے کے بعد کہا۔

شہلا گاڑی سے نیچے اتر کر بیکری کی طرف بڑھنے لگی جبکہ عمر جو کافی دیر سے چپ چاپ بیٹھا تھا اسے آئس کریم کھانے کی سوجھی۔

"بابا مجھے آئس کریم کھانی ہے۔" عمر نے دھیرے سے کہا

"ٹھیک ہے بیٹا میں ابھی تم دونوں کے لیے آئس کریم لاتا ہوں۔" رضا بولا۔

"گاڑی کولاک کروادر سے نیچے مت اترنا ٹریفک بہت زیادہ ہے۔"

رضادروازہ کھول کرباہر نکلتے ہوئے نصیحت کر رہا تھا۔ جبکہ عمر اور عائشہ دروازہ لاک کر کے ادھرادھر کا نظارہ کرنے لگے۔

یکبارگی عاشی کی نظر سڑک کے پار ایک بچی پر پڑی جو گوشت کا شاپر پکڑے کھڑا تھا عید کے دنوں میں ایسے بہت سے غریب بچے ہاتھ میں تھیلے پکڑے گوشت مانگ رہے ہوتے ہیں۔ اور ان غریبوں کی شاید یہی عید ہوتی ہے۔ سارا دن مانگ کر اکٹھا کرنا اور شام کو خوشی خوشی گوشت سے بھرا تھیلا گھر لے جا کر ماں کو دینا..... ہاتھ وہی پھیلاتا ہے جو مجبور ہوتا ہے..... ورنہ خوشی سے کون بھیکاری بنتا ہے۔

جب آجکل کے معاشرے میں امیر بے حس ہو جائیں قربانی کے نام پر فریج بھرنے لگیں۔ غریبوں تک ان کا حق نہ پہنچائیں تو وہ تو ہاتھ ہی پھیلائیں گے نہ.....؟

اوراب تو یوں عید قربان کے دن گھر گھر، گلی گلی اللہ کے نام پر گوشت مانگنا ایک عام سی بات ہوگئی ہے۔ کچھ لوگ جنہیں اللہ کا خوف ہوتا ہے۔ وہ ضرور ان بچوں کے شاپر میں ہڈی بوٹی یا چھیچھڑا ڈال دیتے ہیں اور کچھ تو اپنی حوس اور لالچ میں اللہ کے خوف سے بھی نہیں ڈرتے۔ اور انہی میں سے ایک رضا تھا۔

سڑک کے پاس گوشت کا تھیلا پکڑے بچے کو دیکھ کر عاشی کے ننھے سے ذہن میں فوراً ایک ننھا سا خیال ابھرا۔ عاشی نے سامنے رکھے گوشت کے تھیلے پر نظر ڈالی۔ اس کی ماں شہلا رشتہ داروں کے دینے کے لیے پیکٹس بنا کر رکھے تھے۔ عاشی نے بیکری کی طرف نظریں دوڑائیں۔ ابھی شہلا اور رضا بیکری سے نہ نکلے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ لوگ نکلتے عاشی نے فوراً آگے بڑھ کر اس شاپر میں سے ایک پیکٹ نکالا اور نیچے اترنے لگی۔

"آپی کہاں جا رہی ہو؟" عمر نے پوچھا۔

"پاپا نے تختی سے منع کیا تھا کہ نیچے نہیں اترنا۔"

"تم بیٹھو میں ایک منٹ میں آئی۔" عاشی نے جواب دیا۔

اتنا کہہ کر عاشی سرعت سے گاڑی سے نکلی اور اس نے جیسے ہی روڈ پار کرنے کی غرض سے قدم آگے بڑھائے یکبارگی ایک تیز رفتار گاڑی عاشی کے معصوم وجود سے ٹکرائی اور عاشی کا جسم ہوا میں معلق ہوا۔ گوشت کا پیکٹ ہوا میں اچھلے اور روڈ پر گوشت بکھل گیا۔

عاشی کا جسم نیچے دھڑام سے گرا۔ اس گاڑی کے ڈرائیور نے تختی سے بریک لگائی۔ ٹائر چرچراتے ہوئے گاڑی رکی۔ جس کی وجہ سے لوگ اس طرف متوجہ ہوئے اور لوگوں کا جم غفیر اس طرف لپکا۔ ڈرائیور نے مڑ کر جب پیچھے جم غفیر کو دیکھا تو ایک بار پھر گاڑی گیئر میں ڈال کر نو دو گیارہ ہو گیا۔

لال رنگ کی فراک میں چھوٹی سی معصوم پری بیچ سڑک میں مردہ حالت میں پڑی تھی۔ لوگوں کا ایک جم غفیر لگ چکا تھا۔ شور شرابے کی آواز سن کر رضا اور شہلا بھی اس طرف متوجہ ہوئے اور نجانے انہیں کیا ہوا کہ دونوں تیزی سے اس طرف دوڑے۔

جب دونوں مطلوبہ جگہ پہنچے اور عاشی کا خون میں لت پت مردہ وجود دیکھا تو دونوں کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ دونوں کی سماعت شکن چیخیں بلند ہوئیں۔

شہلا سرعت سے عاشی کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا ننھا سا

وجود اپنی گود میں رکھ کر زار و قطار رونے لگی تھی۔ جبکہ رضا ایک دم سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اسے عاشی کے آخری جملے یاد آنے لگے تھے۔

"دادو نے کہا تھا اگر اللہ کے نام پر کوئی کچھ مانگے تو انکار نہیں کرنا چاہیے۔۔۔۔۔اللہ کے نام پر دینے سے آفتیں ٹل جاتی ہے اور اگر نہ دو تو بہت بڑا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔"

یہ الفاظ بار بار اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ رضا کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ ایک معصوم پری نے اپنی جان دے کر اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔

"عاشی۔۔۔۔۔عاشی اٹھ جاؤ۔۔۔۔۔میری گڑیا۔۔۔۔۔میری پیاری بچی۔۔۔۔۔خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔اپنے پاپا سے ناراض ہو کر مت جاؤ۔۔۔۔۔تم جیسا کہو گی میں ویسا کروں گا۔۔۔۔۔ہم سب مل کر غریبوں کی آبادی میں جا کر گوشت تقسیم کریں گے۔۔۔۔۔بس خدا کے لیے اپنی آنکھیں کھولو" رضا دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔

اس کے الفاظ سن کر سب محو حیرت سے کبھی اسے اور کبھی اس معصوم پری کو دیکھتے جس کے لبوں پر ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ جلوہ گر تھی۔ دونوں میاں بیوی کا رو رو کر برا حال ہو چکا تھا۔

عمر بھی گاڑی سے نکل کر ان کے پاس آ کر بہن کی حالت دیکھ کر رو رہا تھا۔ ایک جم غفیر لگ چکا تھا۔ ٹریفک جام ہو کر رہ گئی تھی۔ کسی نے ایمبولینس کے لیے فون کیا تھا۔ تبھی تھوڑی ہی دیر میں ایمبولینس اور پولیس کی دو گاڑیاں بھی وہاں آن پہنچی لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔۔۔۔۔

فضہ خان۔۔۔۔۔ تحصیل و ضلع ہری پور ہزارہ

معلومات خاص

☆۔۔۔۔۔سائنس دانوں کے مطابق ٹھنڈا پانی گرم پانی سے کچھ زیادہ وزنی ہوتا ہے۔

☆۔۔۔۔۔ایک مرتبہ چھینکنے پر ایک سیکنڈ کے لیے آپ کا دل دھڑکنا بند ہو جاتا ہے۔

☆۔۔۔۔۔لال بیگ اپنا سر کٹنے کے بعد بھی 9 دن تک زندہ رہ سکتا ہے۔

☆۔۔۔۔۔ہر ستارے سے دوسرے ستارے کے درمیان کا فاصلہ تقریباً 20 ملین میل ہوتا ہے۔

☆۔۔۔۔۔دنیا کا سب سے بڑا ج گوکونٹ ہے۔

☆۔۔۔۔۔زمین کا وزن 6500 ملین ملین ملین ٹن ہے۔

☆۔۔۔۔۔نیلی وہیل مچھلی کے دل کا سائز ایک چھوٹی گاڑی کے برابر ہوتا ہے اور اس مچھلی میں اتنی جگہ ہوتی ہے کہ ایک عام انسان اس میں تیر سکتا ہے۔

☆۔۔۔۔۔خلا میں خلاباز رو نہیں سکتا کیونکہ وہاں کشش ثقل نہیں ہوتی۔

☆۔۔۔۔۔دنیا میں کل 6800 زبانیں بولی جاتی ہیں۔

☆۔۔۔۔۔دنیا کی سب سے چھوٹی جنگ برطانیہ اور زنزیبار کے درمیان 1896ء میں ہوئی تھی جو کہ صرف 38 منٹ جاری رہی۔

☆۔۔۔۔۔آبادی کے لحاظ سے عالم اسلام کا سب سے بڑا ملک انڈونیشیا ہے۔

☆۔۔۔۔۔خانہ کعبہ ایک ایسی واحد جگہ ہے جس کے اوپر سے آج تک کوئی پرندہ نہیں گزرا۔

ملک اے بی شاہین۔۔۔۔۔سلانوالی، سرگودہا



آج صبح ہی صبح کیون کو بذریعہ ڈاک کوئی پارسل موصول ہوا تھا۔ جس کے بارے میں وہ قطعاً نہیں جانتا تھا کہ وہ کس کی طرف سے آیا ہے۔ پارسل کے اوپر کوئی نام و رہائش کا پتہ بھی درج نہیں تھا۔ باکس کے اندر چار رفٹ کی حامل ایک نہایت ہی شاندار گڑیا موجود تھی۔ جس کے لمبے لمبے بھورے بال تھے اور اس کے چہرے پر موجود سبز آنکھیں اصلی ہونے کا گمان دیتی تھیں۔

گڑی کے چہرے کی ساخت کو اس طرح سے بنایا گیا تھا کہ وہ دیکھنے والے کی پسندیدگی حاصل کر سکے۔ کیون کی سمجھ سے بالکل بالاتر تھا کہ بھلا کون اسے ایسی لڑکیوں والی گڑیا بھیج سکتا ہے۔ اس نے باکس سے گڑیا کو باہر نکالا۔ جب ہی اسے گڑیا پر لگا ایک کارڈ دکھائی دیا۔ جس پر درج تھا کہ:

”تمہارے لیے۔“

کیون نے وہ کارڈ گڑیا پر سے اتارا اور اسے کھول کر پڑھنے لگا۔

”اب جبکہ میں نے تمہیں ڈھونڈ ھ ہی لیا ہے تو ہم اب کبھی بھی جدا نہیں ہوں گے۔“

ایک عجیب سی تحریر کارڈ پر درج تھی۔ کارڈ پڑھتے وقت کیون کو اپنے اونچے لہجے کا ذرہ برابر احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ کتنی اونچی آواز میں خط پڑھ رہا ہے۔ اس عجیب و غریب تحریر نے کیون کو شش و پنج میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ غور غور سے کارڈ کو الٹ پلٹ کر کے دیکھ ہی رہا تھا کہ دفعتاً ایک عجیب سا خوفناک احساس نجانے کہاں سے اس کے دل میں جڑ پکڑتا چلا گیا کہ کوئی سے دو آنکھیں اسے مسلسل گھور رہی ہیں۔ اس نے بے اختیار کارڈ پر سے نظریں ہٹا کر گڑیا کی جانب دیکھا تو یہ ہی دیکھ کر اسے جھرجھری سی آ گئی کہ گڑیا کی مردہ آنکھوں میں حرکت محسوس ہوئی اور اسے یوں لگا جیسے یہی وہ آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔

یہ احساس اس لیے بھی عجیب تھا کیونکہ جب کیون نے اسے باکس سے باہر نکالا تھا تو اسے یاد تھا کہ گڑیا کا سر نیچے کو جھکا ہوا تھا مگر اس سے بھی زیادہ عجیب اور سنسنی خیز حقیقت یہ تھی کہ گڑیاؤں کا جو دکھائی دے رہی تھی کہ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کیے ہو۔ اس کے چہرے پر اس طرح کی مسکراہٹ موجود تھی جو کہتی ہے۔

”میرے پاس ایک راز ہے۔“

کیون نے اس احساس کو اپنے سر سے جھٹکا اور وہ

کارڈ ٹیبل پر رکھنے کے بعد اس گڑیا کو اٹھا کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ جس کے ایک کونے میں اس نے اس کو کھڑا دیا۔ ایسا کرنے کے بعد وہ اپنے ہی فلیٹ میں ادھر سے ادھر بے مقصد گھومتا رہا تا کہ وہ اپنے اوپر چھائے اس خوفناک احساس کو جھٹک سکے۔ جو اس گڑیا کی وجہ سے اس پر حاوی ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو سمجھا تا بھی جا رہا تھا کہ وہ ایک مرد ہے اس اس طرح ایک گڑیا سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ دیر قبل جو اسے احساس ہوا وہ محض اس کا وہم تھا اور کچھ نہیں۔

آج پیر کا دن تھا۔ کیون نے آفس سے چھٹی کر رکھی تھی کیونکہ کل شام سے اس کی طبیعت کچھ ناساز تھی مگر اب اسے اکیلے گھر میں بور ہونے لگی تھی۔ وہ وقت گزاری کے لیے ٹی وی دیکھتا رہا۔ دو بجے کے قریب اس نے اپنی بڑی بہن گریس کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ جو شادی شدہ تھی۔ گریس کے علاوہ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ گریس کی شادی سے پہلے وہ دونوں ایک دوسرے کے بے حد نزدیک ہوا کرتے تھے اور شادی ہو جانے کے بعد بھی ان کے رشتے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

اپنے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ سے باہر آ کر کیون نے ایک ٹیکسی والے کو اشارہ کیا اور اس میں براجمان ہو گیا۔ ٹھیک چند منٹ بعد ٹیکسی والے نے اس اس کی مطلوبہ جگہ پہنچا دیا۔ کیون نے ٹیکسی سے باہر آ کر ٹیکسی والے کو کرایا ادا کیا اور اس کا شکریہ ادا کر کے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے بلڈنگ کی لفٹ میں پہنچ کر فورتھ فلور کا بٹن پیش کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ فورتھ فلور پر موجود تھا۔

وہ یہ سوچتا ہوا لفٹ لس باہر آ گیا کہ گریس اس وقت اچانک اسے دیکھ کر کتنی خوش ہو جائے گی۔ گریس کی شادی محبت کی تھی اور کیون کو بھی اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ گریس کے شوہر میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو انکار کا باعث بنتی لہٰذا جب شادی سے پہلے گریس نے اپنے ہونے والے شوہر فریڈی کو کیون سے ملوایا تو کیون پہلی ہی ملاقات میں اس سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ اس نے دونوں کا بھرپور ساتھ دیا اور یوں محبت کا انجام شادی پر ہوا کیون نے گریس کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد اندر سے گریس کی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟“

”گریس یہ میں ہوں کیون۔“ کیون نے اپنا تعارف کروایا۔

اگلے ہی لمحے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا گیا۔ گریس اپنے سامنے کیون کو دیکھ کر خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گئی۔

”کیون تم اس وقت یوں اچانک سے یہاں؟“ گریس نے حیرت سے پوچھا۔

”چونکا دیا ناں؟“ کیون مسکراتا ہوا بولا اور دونوں بہن بھائی آپس میں بغل گیر ہوئے۔

”تم سو سال جیو گے قسم سے مجھے تمہاری بہت یاد آ رہی تھی اور دیکھو تم چلے آئے۔“ گریس خوشی سے بولی۔

گریس جواں سالہ خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے چہرے کی تازگی اور شگفتگی بتا رہی تھی کہ وہ اپنی شادی سے بہت خوش ہے۔ کیون نے ہنستے ہوئے گھر کا دروازہ بند کیا اور صوفے آ کر براجمان ہو گیا۔ گریس بھی اس کے قریب جا بیٹھی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نہ۔“ گریس نے کیون کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

ایک بڑی بہن ہونے کے ناطے اسے ہمیشہ اپنے چھوٹے

بھائی کی فکر رہتی تھی۔

"کل شام سے ہلکا سا بخار تھا آج صبح اٹھا تب بھی طبیعت کچھ بوجھل سی تھی۔اس لیے چھٹی کر لی مگر اب کافی بہتر ہوں۔" کیون نے بتایا۔

"ایک تو تم بھی نا اپنا بالکل خیال نہیں رکھتے۔خیر تم بالکل ٹھیک وقت پر آئے ہو اب ہم اکٹھے لنچ کریں گے۔یقیناً تم نے ناشتہ بھی نہیں کیا ہوگا۔میں کھانا لگاتی ہوں" گریس کہتی ہوئی صوفے سے اٹھی اور کچن کی جانب بڑھ گئی۔

گریس گھر میں اکیلی ہی تھی۔فریڈی کام پر گیا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں گریس نے ٹیبل پر کھانا سجا دیا اور دونوں بہن بھائی کھانا کھانے لگ گئے۔کھانے کے دوران گریس نے کیون سے پوچھا۔

"کیسی جا رہی ہے زندگی؟"

"جیسی پہلے تھی۔" کیون نے چاول کھاتے ہوئے جواب دیا۔

"کیون تم پھر سے شادی کیوں نہیں کر لیتے آخر کب تک باہر ہوٹلوں کا کھانا کھاتے رہو گے۔اپنے آپ کو مورد الزام ٹھہرانا چھوڑ دو اور ایک نئی زندگی شروع کرو۔شادی کر کے تمہیں کافی آرام مل جائے گا۔آنے والی تمہارے سب کام کر دیا کرے گی؟" گریس نے سمجھاتے ہوئے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"تم جانتی ہو گریس میں دوبارہ شادی نہیں کروں گا۔چاہ کر بھی اس مشکل وقت کو نہیں بھلا پایا جو مجھ پر گزرا۔" کیون نے اداس لہجے میں جواب دیا۔

"بس بہت ہوا کیون تمہیں یہ سب کچھ بھولنا ہی ہوگا۔تمہاری بیوی کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔میں تمہیں اب اس حالت میں اور نہیں دیکھ سکتی۔بڑی بہن ہوں میں تمہاری۔" گریس نے سنجیدہ مگر فکرمند لہجے میں کہا۔

کیون نے گریس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔وہ خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف رہا۔گریس جانتی تھی کہ وہ اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا لہٰذا اس نے بھی اس معاملے پر مزید بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور خود بھی خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے اس پر کیون سے مزید بحث کی تو وہ کھانا چھوڑ کر چلا جائے گا۔اور وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اس کا پیارا بھائی یوں ناراض ہو کر چلا جائے۔جو اس سے خراب طبیعت ہونے کے باوجود اتنے پیار سے ملنے آ گیا تھا۔کیون نے بھی ایلا سے محبت کی شادی کی تھی۔

کیون جہاں کام کرتا تھا ایلا بھی وہیں جاب کرتی تھی۔دونوں میں دوستی ہو گئی۔جو جلد ہی محبت کا روپ دھار گئی۔ ایلا کا اپنی ماں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔اس نے کیون کو اپنی ماں سے اور کیون نے ایلا کو اپنی بہن سے ملوایا۔دونوں ہی خواتین کو ان کا انتخاب بہت پسند آیا۔یوں شادی بغیر رکاوٹ کے آرام سے ہو گئی۔کیون اپنی شادی شدہ زندگی سے بہت خوش تھا۔ایلا نے جاب چھوڑ کر ہاؤس بننے کو ترجیح دی اور گھر کا سارا انتظام سنبھال لیا۔

گریس اور ایلا میں خوب بنتی تھی۔دونوں میاں بیوی کی رضامندی سے ہی گریس کی شادی ان کی شادی کے ایک سال بعد اپنے من چاہے محبوب فریڈی سے ہوئی تھی۔سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔سب اپنی اپنی زندگی سے خوش

اور مطمئن تھے مگر گرلیس کی شادی کے کچھ ماہ بعد ایک ایلا کو پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ جس نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا۔ کچھ بھی پہلے جیسا نہیں تھا۔ وہ غصے سے چیخیں چلاتی گھر کی چیزیں ادھر ادھر اٹھا کر پھینکتی تو کبھی گھر کے کونے میں چپ چاپ پڑی رہتی نہ کچھ کھاتی نہ پیتی نہ ہی کسی سے بات کرتی۔ چیخ کر بچوں بچوں نہاتی بھی نہیں۔ کیون کے لیے یہ تمام صورت حال نہایت تکلیف دہ اور پریشان کن تھی۔

وہ ایلا سے بہت محبت کرتا تھا۔ اسے اس حال میں نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ اب اکثر حیران و پریشان رہنے لگا تھا کہ یہ اچانک سے ایلا کو کیا ہو گیا تھا۔ اس نے اس کی محبت میں ہر وہ کام کیا تھا جو اس کے بس میں تھا۔ اس نے ایلا کو ایک سے ایک اچھے ڈاکٹر کو دکھایا تھا مگر ڈاکٹر یہی کہتے کہ ایلا دماغی طور پر مفلوج ہو چکی ہے۔ اور اب وہ کبھی ٹھیک نہ ہو سکے گی۔

کیون کے لیے یہ انکشاف کسی موت کے پروانے سے کم نہیں تھا مگر اس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری جہاں تک ہو سکتا تھا اس نے ایلا کے لیے سب کچھ کیا بلکہ اپنی بساط سے بھی زیادہ کیا۔ ایسے میں اس کی بہن اور اس کے شوہر نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ ان سب کی سمجھ سے یہ بالاتر تھا کہ ایک اچھی بھلی تندرست لڑکی جس کو کبھی کوئی دماغی عارضہ لاحق ہوا ہوا سے اچانک پاگل پن کے دورے کیونکر پڑنے لگے اور نتیجہ یہ کہ وہ پاگل کیوں ہو گئی......؟

ایلا کی ماں کا کہنا تھا کہ اس کی بیٹی دماغی طور پر بالکل صحت مند تھی۔ اسے کبھی بھی کسی قسم کے دورے نہیں پڑے تھے۔ شادی کے بعد نجانے کس کی نظر اس کی ہنستی بستی خوشیوں کو لگ گئی تھی۔ ایلا کی ماں اپنی بیٹی کو نیا وہ دیر اس حالت میں نہ دیکھ سکی اور دماغ مفارقت دے گئی۔

ایسے موقع پر یہ سانحہ بھی اس گھرانے کے لیے بہت بڑا تھا۔ انہوں نے جیسے تیسے کر کے ایلا کی ماں کی تدفین کر دی۔ کیون نے چار سال ایلا کا پاگل پن برداشت کیا۔ اس کے بعد اس کی ہمت بھی جواب دینے لگی۔ گرلیس بھی اب وقتاً فوقتاً اس سے کہنے لگی تھی کہ ایلا کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہے۔

بہتر ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے کیون کے لیے یہ ایک مشکل امر تھا لیکن اب اس کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ چنانچہ دل پر جبر اپتھر رکھ کر اس نے ایلا کو دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ اس سوچ کے پیش نظر کہ اسے وہاں بہتر علاج کی سہولت فراہم ہوگی۔ وہ ہفتے میں ایک دو بار لازمی ایلا سے ملنے ہسپتال چلا جایا کرتا تھا مگر یہ دیکھ کر اسے نہایت دکھ کا احساس ہوتا تھا کہ ایلا بہتری کی جانب جانے کی بجائے مزید ابتر ہوتی جا رہی تھی۔

اور پھر ایک دن اچانک اسے اطلاع ملی کہ ایلا ہسپتال کے بستر پر دم توڑ گئی ہے۔ یہ خبر کیون پر پہاڑ بن کر گری۔ وہ فوراً سے بھی پیشتر ہسپتال پہنچا اور بیڈ پر پرسکون لیٹی ایلا کو دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ گرلیس اور فریڈی اسے تسلیاں دے رہے تھے مگر اس کے دل کو قرار کہاں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی اس کا دم بھی نکل جائے گا۔

ایلا کے ساتھ اس نے محبت کی شادی کی تھی۔ لیکن وہ ایلا کے ساتھ صرف ایک سال ہی خوشی سے گزار سکا تھا۔ شادی کے دوسرے سال اس کی ہنستی بستی زندگی کو کسی کی نظر لگ گئی تھی اور یہ سلسلہ لگاتار چار سال تک جاری رہا۔ وہ اسی امید پر ایلا کا

ہاتھ تھامے ہوئے تھا کہ شاید ایلا ایک دن ٹھیک ہو جائے اور وہ دونوں ایک بار پھر سے اپنی وہی زندگی شروع کر سکیں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

ایلا ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر منوں مٹی تلے جا سوئی تھی۔ پہلے ایلا بالکل پاگل تھی تو کیا ہوا وہ ایلا کو دیکھ تو لیتا تھا مگر اب وہ اسے کبھی نہ دیکھ سکے گا۔ سوچ نہایت جان لیوا تھی اور وہ روتا چلا گیا اور اتنا رویا کہ آنسو خشک ہو گئے۔ اب وہ نہ ہنستا تھا نہ مسکراتا تھا۔ زندگی کی ہلچل جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ گریس اور فریڈی نے ایسے میں مل کر کیون کا بہت خیال رکھا۔ دونوں کیون کے ساتھ اس کے گھر ہی شفٹ ہو گئے تھے۔ گریس اسے ٹائم پر کھانا دیتی۔ اس کے کپڑے دھو کر استری کرتی ورنہ اسے تو اپنی ہوش ہی نہ رہی تھی۔ کھانا مل جاتا تو کھا لیتا نہیں تو بھوکا ہی سو جاتا۔

اسی حالت میں اس کی جاب بھی جاتی رہی تھی۔ وہ خود کو موردِ الزام ٹھہراتا کہ اگر وہ ایلا کو ہسپتال داخل نہ کرواتا تو آج اس کی ایلا اس کے پاس زندہ ہوتی۔ وہ ہسپتال والوں سے بہتر اس کا خیال رکھ لیتا۔ شاید انہوں نے اچھے سے اس کا خیال نہیں رکھا تھا مگر گریس اسے سمجھاتی کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ایلا مکمل طور پر پاگل اور جنونی ہو چکی تھی۔ جو کیون کو بھی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ ایسے میں اسے ذہنی امراض کے ہسپتال میں داخل کروانا کوئی غلط قدم نہیں تھا۔ کیون نے تو ایسا اس کی بہتری کے لیے کیا تھا۔ یہ تو اس کی زندگی تھی جو اس سے وفا نہ کر سکی۔ اور اسے ہر اذیت سے نجات مل گئی۔ دونوں میاں بیوی کی بھرپور کوششوں سے کیون زندگی کی جانب لوٹنے لگا تھا۔

اگر مسکرا لیا تو اس میں بھی آنسو ہوتے۔ اسے اچھی سی نئی جاب بھی مل گئی تھی۔ یوں وہ زندگی کے معمولات میں انٹرفیئر کرنے لگا تھا۔ گریس اور فریڈی اسے بارہاں دفعہ کہہ چکے تھے کہ وہ کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر گھر بسا لے مگر کیون ان کی اس بات پر کبھی کان نہیں دھرتا تھا۔ اسے ایلا سے شدید محبت تھی اور ایلا کے سوا وہ اپنے دل میں کسی اور لڑکی کو جگہ نہیں دے سکتا تھا۔ یوں ایک سال مزید گزر گیا تھا۔

"پتا ہے آج صبح بذریعہ ڈاک مجھے ایک پارسل موصول ہوا ہے جس کے اندر ایک گڑیا بند تھی۔" کیون نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے گریس کو بتایا تو اس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے گھورا۔

"مگر وہ بھیجا کس نے تھا......؟" گریس نے پوچھا۔

"پتا نہیں اس پر واپسی کا تو کوئی ایڈریس درج نہ تھا نہ ہی بھیجنے والے کا کوئی نام و پتہ یا فون نمبر۔" کیون نے جواب دیا۔

"یہ تو اس سے بھی بڑی عجیب بات ہے۔" گریس نے اس کی حیرت کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں یقیناً ہے۔" کیون بولا۔

"وہ دکھتی کیسی ہے......؟" گریس نے عجیب سا سوال داغا۔

"ایسی ہی خوبصورت گڑیا ہے بس گزارے لائق۔"

گریس نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ "ہے تو عام سی گڑیا کی مانند لیکن قد چنداں لمبا ہے۔" کیون نے بتایا۔

"ہوں۔" گریس ہونٹ بھینچ کر بولی۔

اس کے بعد گریس نے اپنے اور کیون کے لیے چائے بنائی۔ چائے کے دوران دونوں کے درمیان کوئی خاص بات نہ

ہوگئی۔ تھوڑی ہی دیر میں فریڈی بھی پہنچ گیا اور کیون کو دیکھ کر حیرت ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی ہوگیا۔ آج برسوں بعد اسے کیون کے لبوں پر مسکراہٹ دکھائی دی تھی۔ دونوں آپس میں بغل گیر ہوئے۔

گریس نے دھیرے سے فریڈی کو سمجھایا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے کیون کو تکلیف ہو۔ باتوں باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہ چلا اور رات کے سائے پر پھیلانے لگے۔ رات کا کھانا سب نے مل کر ہی کھایا۔ گریس کھانا بہت اچھا بناتی تھی۔ کھانے والا انگلیاں چاٹتا رہ جاتا تھا۔ کھانے کے بعد کیون نے ان دونوں سے رخصتی کی اجازت چاہی۔

"آج نہیں کیون رک جاتے تو بہتر تھا۔ ویسے بھی تمہاری طبیعت بھی ناساز ہے۔" گریس فوراً بولی۔

"نہیں میں اب بالکل ٹھیک ہوں تم دونوں کو خوش دیکھ کر تو بالکل ہشاش بشاش ہوگیا ہوں۔" کیون زیرِ لب مسکرا کر بولا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ دونوں میاں بیوی میں کباب کی ہڈی بنے۔ وہ ان دونوں کو مکمل وقت دینا چاہتا تھا۔ کیون نے اپارٹمنٹ کے باہر آ کر ٹیکسی والے کو اشارہ کیا اور اسے پتہ سمجھا کر ٹیکسی کی پچھلی نشست پر براجمان ہوگیا۔ وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے باہر کے گزرتے مناظر دیکھتا رہا۔ چند منٹ بعد ٹیکسی اس کے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کے باہر ایستادہ تھی۔ کیون نے ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کیا اور اپارٹمنٹ کی بلڈنگ میں پہنچ کر اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولنے لگا۔ اس کا فلیٹ پہلے فلور پر ہی تھا۔ اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھ کر کیون کو ایک بار پھر تھکن کا احساس ہوا۔ ڈرائنگ روم میں آیا۔ جس کی لائٹیں آن کرتے ہی اس کی نگاہیں نہ چاہتے ہوئے بھی سیدھی گڑیا پر جا ٹھہریں۔

چارفٹ کی حامل گڑیا اس وقت مکمل کوئی جیتی جاگتی انسانی لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔ جو کمرے کے ایک کونے میں کھڑی زندگی سے بھرپور تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر کیون کے ذہن کے دریچوں پر کوئی چہرہ دستک دینے لگا۔ گڑیا کا چہرہ اسے کسی کی یاد دلا رہا تھا۔ مگر کس کی.....؟

کیون کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیونکہ اس کے ذہن میں وہ چہرہ دھندلایا ہوا تھا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہ چہرہ اس نے پہلے کہاں دیکھا ہے؟

کیون ڈرائنگ روم سے باہر نکل کر ہال میں آ گیا۔ اس بات سے انجان اور بے خبر کہ گڑیا کی آنکھیں اس کے پلٹ جانے پر گھومی تھیں۔ کیون نے سونے سے پہلے شاور لینے کا سوچا اور واش روم میں جا کر شاور کھول کر اس کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ پانی کی تیز بوچھاڑ جیسے جیسے کیون کے جسم کو دھو رہی تھی ویسے ویسے کیون کے ذہن پر پڑی گرد بھی دھلتی چلی گئی اور اسے ماضی کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ اب اسے یقین آتا جا رہا تھا کہ گڑیا کی شکل کس سے ملتی ہے.....؟

کیون پہلے جس آفس میں کام کرتا تھا۔ وہاں ایک لڑکی بھی کام کرتی تھی۔ جس کا نام اپریل تھا۔ اپریل اپنے کام سے کام رکھنے والی ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ کسی سے فالتو بات کرنا اسے پسند نہیں تھا۔ وہ سنجیدہ مزاج کی حامل تھی۔ سانولی رنگت پر بھورے بال اور سرمئی آنکھیں اسے کافی پرکشش بناتی تھیں۔ کسی نے بھی اس کو کسی کے ساتھ اتنا فری ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی فی میل کولیگز کے ساتھ بھی اختلاط نہیں کرتی تھی۔ پھر ایک

دن ایک بے حد خوبصورت نوجوان نیا نیا جاب پر آیا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ کیون تھا۔

جس کے حسن نے ایک ہی نظر میں اپریل جیسی لڑکی کو بھی پاگل کر دیا تھا۔ وہ کیون سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈھنے لگی۔ جس کام کی کیون کو سمجھ نہ آتی۔ جلدی سے آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنے میں پہل کرتی۔ اپریل کا یہ نیا روپ آفس کے تمام ممبران کے لیے بالکل نیا اور عجیب تھا۔ خود کیون اپریل کی اس قدر عنایات اور مہربانی پہ کبھی کبھی عجیب تجل سا ہو جاتا تھا۔ جب کبھی وہ بے خیالی میں اپریل کے پاس کھڑا ہو جاتا تو آفس والوں کی نظریں اسے اشاروں میں بہت کچھ کہتی ہوئی نظر آتیں۔ ان سب کے چہروں پر معنی خیز مسکراہٹیں اسے شرمندہ کر دیتیں۔ کیون ان سب باتوں سے بے حد پریشان رہنے لگا تھا۔ اسے اپریل صرف ساتھی کولیگ کی حد تک پسند تھی۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ جس کام بھی کیون کو مشکل پیش آتی۔ اپریل سب سے پہلے آگے بڑھ کر اس کی مدد کر دیا کرتی۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اپریل ایسا کیوں کرتی تھی۔ مانا کہ سٹاف کی باقی لڑکیاں بھی کیون پر فریفتہ تھیں کیونکہ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا نوجوان تھا۔ لڑکیوں کو زیادہ گھاس نہ ڈالتا تھا۔ اس کی یہی خوبی لڑکیوں کی نظر میں نمایاں تھی۔ مگر اپریل کیون سے محبت کرنے لگی تھی۔ مگر کیون کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نجانے کیوں اسے اپریل میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ آفس کے باقی لڑکوں کی نظروں میں کیون ایک خوش قسمت انسان تھا جسے اپریل خود لفٹ کروا رہی تھی کیونکہ اپریل آفس کی تمام لڑکیوں سے زیادہ سمارٹ اور خوبصورت تھی۔

انمول ہیرے

☆۔۔۔۔سب سے اچھا استاد۔۔۔۔اپنا ضمیر

☆۔۔۔۔سب سے عمدہ چیز۔۔۔۔شرافت

☆۔۔۔۔سب سے بڑی مصیبت۔۔۔۔قرض

☆۔۔۔۔سب سے بڑی دولت۔۔۔۔علم

☆۔۔۔۔سب سے بڑا راگ۔۔۔۔خاموشی

☆۔۔۔۔سب سے بڑا دشمن۔۔۔۔تکبر

ملک این اے کاوش۔۔۔۔سلانوالی سرگودہا

وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنا ہوا تھا۔ اسے اپریل کے جذبات کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اس نے کبھی اپریل کے ان التفات کا جائزہ فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ایک پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ جس نے کبھی اپریل سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ جس سے اپریل کے حوصلوں کو مزید جوش ملتا۔ آفس کے تمام ممبران کے سامنے یہ معاملہ کسی کھلی کتاب کی طرح روشن اور عیاں تھا۔ کہ اپریل کیون میں شدید دلچسپی لے رہی ہے اور کیون اسے برابر نظر انداز کیے ہوئے ہے۔ لنچ ٹائم پر کیون کو اکیلا بیٹھا دیکھ کر اپریل اس کے ساتھ بیٹھ کر لنچ کرنا شروع کر دیتی۔

بات صرف یہیں تک محدود نہیں رہی تھی۔ اپریل اب ان سب سے کہیں زیادہ آگے جا چکی تھی۔ آفس سے چھٹی ہو جانے کے بعد گھر واپسی پر کیون اکثر اسے اپنا پیچھا کرتے ہوئے پاتا۔ کیون جہاں جاتا کچھ ہی لمحوں بعد وہ وہاں آن موجود ہوتی اور اسے چھپ چھپ کر دیکھتی رہتی۔ کیون نے اسے اپنا فون نمبر نہیں دے رکھا تھا مگر اس کے باوجود وہ اس کے بارے میں

باخبر رہتی تھی کہ وہ کب کیا کرتا ہے؟ کہاں جاتا ہے؟ کیون کی برداشت اب جواب دیتی جارہی تھی۔ اس نے ایک دوبار اپریل کو ایسا کرنے سے منع بھی کیا تھا۔ جب پھر بھی وہ باز نہ آئی تو اس کے ساتھ سختی بھی پیش آیا مگر وہ بھی کہ پھر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی۔ اگر اپریل کی محبت یکطرفہ تھی مگر وہ کیون کی محبت میں اتنا آگے جا چکی تھی کہ اسے اپنی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ کیون اس سے محبت نہیں کرتا۔ الٹا اسے نظرانداز کیے رکھتا ہے۔ اسے شاید خود بھی یقین تھا کہ ایک دن وہ کسی طور بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی تو کیون نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب وہ اپریل کا نیا وہ نوٹس لے لیتا تھا۔

اس نے کئی بار چاہا کہ یہاں سے جاب چھوڑ کر کیون چلا جائے مگر کیون اتنی اچھی جاب گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ کیا معلوم کہ وہ جہاں جائے اپریل بھی وہاں آن دھمکے۔ اور پھر وہ اپریل کی وجہ سے اپنا کیا پیچھے چھوڑتا۔ جاب، گھر یا پھر شہر ہی؟

اپریل اس کے پیچھے کہیں بھی آسکتی تھی۔ اس لیے کیون نے یہ فیصلہ بھی ترک کر دیا۔ اس نے کئی آفس منیجر سے اپریل شکایت کرنا چاہی مگر وہ ایسا بھی نہ کر سکا۔ منیجر آفس کے اندر اپریل کو کنٹرول میں رکھ سکتا تھا مگر آفس والوں نے کیون کو اپنی دوسری برانچ میں شفٹ کر دیا۔ جس سے جان چھوٹی مگر یہ سکون بھی زیادہ دن نہ رہا۔ پچھلے دنوں بعد اپریل بھی اسی برانچ میں آن وارد ہوئی۔ جدھر کیون پہلے سے موجود تھا۔ اب کیون آفس میں ایک نئی لڑکی آن وارد ہوئی۔ وہ ایلا تھی جو ایک ہی نظر میں کیون کی آنکھوں سے سیدھا اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ ایلا بھی نئی تھی۔ لہٰذا اسے سارا کام کیون نے سمجھایا۔ جلد ہی دونوں میں خوب دوستی ہوگئی جو پیار میں بدل گئی۔ اپریل یہ سب چپ چاپ دیکھتی رہی تھی مگر اندر ہی اندر جلتی کڑھتی تھی۔ ایلا کے آجانے کے بعد کیون نے اپریل کی طرف دھیان ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ کیون کا پیچھا کرتی ہے یا نہیں کیون کو ان سب باتوں سے اب کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ ایلا کے آجانے سے اس کی زندگی مکمل ہو گئی تھی۔ اسے اپنی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ وہ اپریل کی کیا ہوش رکھتا۔

ایک رات کوئی اس بجے کے قریب کیون اپنے گھر میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ جب ہی اس کے موبائل پر کوئی کال موصول ہوئی۔ کیون نے ٹی وی پر سے نظریں ہٹا کر سیل کی جانب تو کوئی اجنبی نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے فون او کے کر کے کان سے لگایا تو دوسری طرف سے اپریل تھا۔

"تم.....؟" کیون حیرت سے اچھل پڑا۔

"تمہیں میرا نمبر کس نے دیا۔

"یہ چھوڑو مجھے تمہارا نمبر کس نے دیا۔ بس مجھے تم سے ابھی اور اسی وقت ضروری ملنا ہے۔ آخری بار میری بات سن لو پھر میں تمہیں کبھی تنگ نہیں کروں گی۔" اپریل کی آواز ابھری۔

وہ ایسے بول رہی تھی گویا بہت ہی جلدی میں ہو۔

"سچ کہہ رہی ہو؟" کیون نے بے یقینی سے کہا۔

"وہ اسے دوبارہ تنگ نہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ وہ اسے پریشان کرنے سے باز نہ آتی تھی۔

"ہاں۔" اپریل نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تم ابھی میرے فلیٹ میں آجاؤ۔ میں اکیلا ہی ہوں۔" کیون نے کہا۔

تو اپریل خوشی کے مارے اچھل پڑی۔ اسے کیون کے


جشن آزادی
مبارک


عید الاضحی المبارک

اتنی آسانی سے مان جانے کا یقین نہیں تھا اسی نے شکریہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

کیون ہاتھ میں فون تھامے کافی دیر اپریل کے بارے میں سوچتا رہا اپریل نے جو کچھ کہا تھا ان باتوں کا بالکل یقین نہیں تھا۔ وہ لڑکی جو کسی صورت اس کی جان چھوڑنے کو تیار نظر نہ آتی تھی اب وہ اچانک سے کیسے آمادہ ہو گئی تھی......؟

اب وہ نجانے اس سے کیا کہنے والی تھی۔ ضرور وہ اس کے سامنے اپنی محبت کا یقین دلائے گی۔ مگر وہ اپریل سے محبت کرتا تھا اپریل اس کے دل میں کہیں نہیں تھی۔ اب جو موقع ہاتھ آیا تھا تو اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اپریل سے اب جان نہ چھڑائی تو پھر ہمیشہ کے لیے جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔ کیون نے اپنے ذہن میں تمام پلان ترتیب دیا اور اسی پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

تیس پچیس منٹ بعد کیون کے فلیٹ کی ڈور بیل بجی۔ کیون نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تو سامنے اپریل کو موجود پایا۔ وہ سفید لباس میں ملبوس نہایت پرکشش لگ رہی تھی۔ کیون دروازے سے ایک طرف ہو گیا اور اپریل اندر چلی گئی۔

"اس ٹائم گھر والوں سے کیا کہہ کر میری طرف آئی ہو؟" کیون نے پوچھا۔

"میں اس دنیا میں اکیلی ہوں۔" اپریل نے جواب دیا تو کیون اسے خالی خالی نگاہوں سے گھورنے لگا۔ جیسے اسے اپریل کی بات پر یقین نہ ہوا ہو۔

"بیٹھو کیا لو گی چائے یا کافی یا کوئی مشروب؟" کیون کچن کی جانب جاتا ہوا بولا۔

"مشروب ٹھیک رہے گا۔" اپریل نے کہا اور صوفے پر براجمان ہو گئی۔

کچھ ہی دیر میں کیون کچن سے مشروب کے دو گلاس اٹھا لایا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے مشروب کا گلاس اپریل کو تھما دیا۔

"کیون تم مجھ سے کیا بات کرنے آئی ہو؟" کیون نے اپریل کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ پہلے آرام سے مشروب تو پی لوں۔ پھر بات بھی کر لیتے ہیں۔" اپریل بولی۔

دونوں نے ایک ساتھ مشروب کے گلاس اٹھا کر لبوں سے لگائے۔ مشروب پیتے ہی اپریل کا سر بھاری ہونے لگا اور آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ سی چھانے لگی۔ کیون اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اپریل کو سب کچھ گھومتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ سے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ اچانک ہی لمحوں میں اس کا ذہن مکمل تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ کیون نے اپریل کے مشروب میں کوئی نشہ آور دوا ملائی تھی۔ جس نے بہت جلد اپنا کام دکھایا تھا۔ کیون نے جلدی سے اپنا بقیہ مشروب ختم کیا اور گلاس واپس میز پر رکھنے کے بعد اپریل کو اپنی بانہوں میں اٹھایا جو کرسی پر ہی ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ وہ اسے لے کر اپنے بیڈروم میں آیا اور جا کر اپنے بستر پر لٹا دیا۔ چند لمحے کیون اپریل کے چہرے کو یک ٹک دیکھتا رہا جو کہ بڑے سکون سے بے ہوشی کی دنیا میں داخل ہو چکی تھی۔

اس کے بعد کیون نے اپنے آفس کے ان دوستوں کو فون کیا جو اپریل کو پسند کرتے تھے۔ مگر اپریل انہیں گھاس تک نہیں ڈالتی تھی۔ وہ اکثر کیون سے کہتے رہتے تھے کہ تم اپریل کو پسند

خبر

تقریب ساگر ایوارڈ

(رپورٹ ساحل ابڑو) ملی ادبی فاؤنڈیشن پاکستان کا قیام 15 جنوری 2017 کو عمل میں لایا گیا۔ اس سے مختلف ادبی تقاریب اور انسانیت کی خدمت کا سلسلہ بھی شروع ہوا جہاں جعفرآباد میں ادبی سرگرمیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ وہاں ملی ادبی فاؤنڈیشن پاکستان کے قیام سے ایک مرتبہ پھر ادبی حلقوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس لئے بر وقت ملی ادبی فاؤنڈیشن کی طرف سے کوئی نہ کوئی ادبی بیٹھک منعقد ہوتی رہتی ہے۔ تنقیدی حاضری یا محفل مشاعرہ انسانی خدمت ہو یا ادبی تقاریب ہر پروگرام میں اہل قلم کا جم غفیر شامل ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے بلکہ آج تک کوئی ایسی ادبی تنظیم نے صحیح نمائندگی نہیں کی جو نوجوان قلم کاروں کی آبیاری کر سکے۔ ملی ادبی فاؤنڈیشن اور طارق اسماعیل ساگر لائبریری کے قیام سے حلقہ اہل قلم و ذوق میں یہ خوشی بھی محسوس کی گئی ہے کہ انہیں ادبی محافل کے علاوہ لائبریری میں ہر قسم کی ادبی کتابیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ کیونکہ بہترین ادب تخلیق کرنے کے لیے وسیع مطالعہ کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ یہی مطالعہ ضرورت مند نوجوان قلم کاروں کی علمی ادبی تسکین کرتا ہے۔

ملی ادبی فاؤنڈیشن کی جانب سے بلوچستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ دنیائے ادب و قلم کے معروف کالم نگار ایک سو سے زائد کتابوں کے مصنف عالمی شہرت یافتہ طارق اسماعیل ساگر کی ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے ان کے نام سے پاکستان کی سطح پر تقریب ساگر ایوارڈ کا انعقاد کیا جائے گا۔ اس پروقار تقریب کو رونق بخشنے کے لیے طارق اسماعیل ساگر لاہور، محمد سلیم اختر فیصل آباد، عبدالعزیز جی آنچول، عادل ابڑو نصیر آباد و عجب خان ساگر تجھیر ادب کے بہترین عبداللہ نظامی اس تقریب میں فنکاروں کو ایوارڈ اور اعزازات سے نوازیں گے۔ اس کے علاوہ دیگر اہم شخصیات کو بھی مدعو کیا جائے گا۔

اس تقریب میں گمنام اور محروم طبقے کو زیادہ ترجیح دی جائے گی جنہیں جان بوجھ کر ادب کی دنیا سے دور رکھا گیا ہے یا معاشی حالات اور بے روزگاری کی وجہ سے ادب کی دنیا سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ملی ادبی فاؤنڈیشن کا مقصد ہی محروم طبقے کے دل میں ادب اور انسانیت کا دعا ہے۔

تقریب ساگر ایوارڈ تقریب میں ملک بھر کے قلم کاروں اور خصوصی ڈر ڈائجسٹ کے تمام رائٹرز کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ 15 ستمبر تک اپنی شائع شدہ کتاب کی تین جلدیں یا کسی بھی ادبی میگزین رسالے، ڈائجسٹ میں شائع شدہ افسانے، ناول، [illegible]، اور آپ بیتیاں وغیرہ کی تین تین فوٹو کاپیاں اپنا مختصر تعارف اور ادب کے فروغ کے حوالے سے اپنی کاوش کی مفصل رپورٹ مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال کریں

ساحل ابڑو وائس چیئرمین
آفس ملی ادبی فاؤنڈیشن پاکستان
نزد گلشن بہار لنک ڈیرہ اللہ یار بلوچستان

مزید معلومات اس نمبر پر حاصل کر سکتے ہیں۔ 0333-3279517 تقریب ساگر ایوارڈ کو کامیاب بنانے کے لیے بھرپور محنت کریں اور بلوچستان کی تاریخ میں ہونے والی اس پہلی اور منفرد ساگر ایوارڈ کو کامیاب بنائیں۔ یاد رہے کہ اس پروگرام میں خصوصی تعاون ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی کی طرف سے بھی ہے۔

نہیں کرتے تو اسے بہانے سے کسی طرح کہیں پر بلاؤ وہ تمہاری بات کبھی نہیں ٹالے گی۔ اور باقی کام ہم پر چھوڑ دو۔ کیون کہیں پر پر بلاؤ تو وہ تمہاری بات کبھی نہیں ٹالے گی اور باقی کام ہم پر چھوڑ دو۔ کیون نے ان کی ان باتوں پر کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ شریف لڑکا تھا۔ اسے نہیں پسند تھا کہ کسی لڑکی کی عزت کے ساتھ یوں جارحانہ سلوک کیا جائے مگر اب جبکہ کیون ایلا سے شادی کیلئے سنجیدہ تھا۔ لہٰذا اپریل سے جان چھڑانا ضروری ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ ان دونوں کی زندگی میں زہر گھول سکتی تھی کیونکہ جس طرح کی حرکتوں کا وہ مظاہرہ کر چکی تھی۔ ان سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ بھی کر گزرنے والی لڑکی تھی۔ اب کیون اس سے اس کی ان تمام حرکتوں کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ جن کی وجہ سے اس کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ اپریل نے اسے بہت تنگ کیا تھا۔ لہٰذا اب بدلے کی گھڑی آ گئی تھی۔ اس نے باری باری ان لڑکوں کو فون کیا۔ وہ لڑکے گنتی چار تھے۔ جو کچھ ہی دیر بعد کیون کے گھر آ پہنچے۔

"واہ کیون آخر تم نے ہماری بات مان ہی لی۔" ان چاروں لڑکوں میں سے ایک نے خوشی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم لوگ آرام سے اپنا کام کرو۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ میری بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ دوسرے شہر گئی ہوئی ہے۔" کیون نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے" ایک دوسرا لڑکا بولا۔

اتنا کہہ کر چاروں ہنستے قہقہے لگاتے اپریل پر ذومعنی فقرے کستے ہوئے اس بیڈ روم میں جا گھسے جدھر اپریل بے ہوش پڑی تھی۔ وہ چاروں بیڈ پر چڑھ گئے اور بے ہوش اپریل کو بانہوں میں لے کر اس کے جسم کے نشیب و فراز سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ کوئی کچھ کر رہا تھا تو کوئی کچھ کر رہا تھا۔ وہ چاروں اس کے ساتھ یوں چپکے ہوئے تھے گویا چار بلیاں ایک ہی چوہے پر لپکی پڑی ہوں۔ کیون فاشی کا یہ نظارہ خاموشی اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ کسی تاثر سے یکسر عاری دل میں نہ کوئی ملال تھا نہ ہی کوئی بوجھ۔

وہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک کر رہا تھا۔ اپریل اپنی حدوں سے زیادہ آگے جا چکی تھی۔ اور کیون کو اس سے اتنی ہی نفرت تھی اپریل سے جان چھڑانے کے لیے اس سے بہتر کوئی طریقہ کیون کی نظر میں نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ جو کچھ کر چکی تھی اس کے بدلے میں اس سب کی حق دار تھی۔

اپنے جسم پر وحشیانہ سلوک کو محسوس کر کے اپریل کے ہواس واپس آنے لگے۔ سماعت کے پردوں پہ ان چاروں کی آوازیں اور قہقہے دستک دینے لگے۔ رفتہ رفتہ اس کی پلکیں کھلنے لگیں۔ ذہن کے تاریک گوشوں میں روشنی ہونے لگی اور پھر چند لمحوں بعد اپریل کا سویا ذہن بیدار ہوا۔ اب جان سب کی آوازیں پہلے سے صاف سن سکتی تھی۔

"لگتا ہے یہ ہوش میں آ رہی ہے دیکھو اپنے ہاتھ پاؤں کو جنبش دینے لگی ہے۔" ان میں سے ایک بولا۔

"واہ اب تو پھر اور بھی مزہ آئے گا۔" دوسرے نے کہا۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں اپریل کے مدہوش ذہن کو ان کی تمام باتیں سمجھ میں آ گئیں کہ وہ کس طرح کی گفتگو کر رہے تھے۔ اب وہ اپنے جسم کو بھی ہلکا ہلکا جنبش دے سکتی تھی۔ اور وہ اچھے سے اپنے جسم پر درندگی ہوتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر جھٹ سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں نشے کی وجہ سے سرخ انگارہ ہو رہی تھی۔ اپنے اوپر ایک نہیں

چار چار لڑکوں کو جھکا ہوا دیکھ کر اس کے واپس اٹھائے ہوئے ہوش ایک بار پھر سے منتشر ہونے لگے تھے۔اس نے اٹھنا چاہا مگر انہوں نے اسے ایسا کرنے نہ دیا۔اس کے سر سے درد کی شدید لہریں اٹھ رہی تھی۔اسے اب بھی سب کچھ گھومتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔جس میں بھی جیسے جان باقی نہ رہی تھی۔اس نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی اور اس بار اس کی کوشش رائیگاں نہیں گئی۔وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔مگر اٹھنے میں اس کی مدد کرنے والے بھی وہ چاروں ہی تھے۔جو کسی لباس کی طرح اس سے چپکے ہوئے تھے۔اور اس کے بدن کے ساتھ خوب من مانی پر اترے ہوئے تھے۔اس کا سر اب بھی بھاری تھا۔اور نشے کی زیادہ مقدار کی وجہ سے اب کہ ٹھیک سے سمجھ رہی تھی۔وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں ادھر سے ادھر گھما رہی تھی جب ہی اس کی نگاہیں کمرے کے باہر کھڑے کیون پر جا ٹھہریں جو نہایت خاموشی اور سفاکی کے ساتھ درندگی کا یہ عملی مظاہرہ دیکھ رہا تھا۔اپریل کی آنکھیں فرطِ حیرت کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور آنسوؤں کی لکیریں اس کی آنکھوں کے گوشوں سے بہنے لگیں۔اب اس نے اپنے ساتھ چپکے ہوئے لڑکوں کے چہرے دیکھے تو نشے کی حالت میں ہونے کے باوجود اسے پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ یہ سب اس کے آفس کے کولیگ تھے۔

"کیا کیون ایسا بھی کر سکتا ہے......؟"

اپنی آنکھ سے دیکھ لینے کے باوجود اسے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔اب اسے ساری بات یاد آ گئی کہ وہ کیون کے گھر اس سے ضروری بات کرنے کے لیے آئی تھی۔کیون نے اسے مشروب پلایا تھا۔جس کے بعد اسے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔

وہ لڑکا جس نے آج تک خود بھی اس کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی سعی نہیں کی تھی۔آج وہ خود نہیں تو اپنے دوستوں سے اس کی عزت تار تار کروا رہا تھا۔اس کی حیرت و بے یقینی سے پھٹی آنکھیں کیون کی آنکھوں میں پیوست تھیں۔جو سپاٹ چہرہ لیے اس کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔اس نے ان چاروں کی گرفت سے نکلنے کی سعی کی مگر وہ اکیلی ان چاروں کے آگے بے بس تھی۔اس کا کمزور احتجاج ان کے آگے کچھ نہیں تھا۔یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی بکری شیروں کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کرے۔اس کی آس بھری نگاہیں ہنوز کیون پر جمی ہوئی تھیں۔اس نے اپنی لڑکھڑاتی اور نشے سے ڈوبی آواز میں کیون کو پکارا۔"کیون۔" آواز نہ ہی ہوئی تھی اور لہجہ ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہی ہو کیون کیا سچ میں یہ تمہارا اصل روپ ہے؟

کیون جواب میں خاموش رہا اور ٹکٹکی لگائے اسے گھورتا رہا۔اس کی نگاہیں مسلسل کیون پر جمی ہوئی تھیں اور چاروں برابر اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھے۔اس نے دو تین بار کیون کو یوں پکارا جیسے التجا کر رہی ہو مگر اس نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کی جگہ ایک لڑکا بے حیائی سے بولا۔"میری جان ہم چاروں ہیں نہ یہاں تو پھر کیون کی کیا ضرورت ہے؟"

کیون کمرے کے دروازے سے ہٹ کر دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔اور وہ چاروں ساری رات اپریل کی عزت کی دھجیاں اڑاتے رہے۔وہ نازک لڑکی ان کے اس وحشیانہ سلوک کو سہہ نہ سکی اور رات کے کسی پہر دم توڑ گئی۔

اپریل کی موت کا یقین ہوا تو وہ پانچوں اس کی لاش کے لیے متفکر ہو گئے۔وہ سب کافی دیر تک غور و خوض کرتے رہے

اور یوں آخر یہی طے پا گیا کہ اپریل کی لاش کو کسی ویرانے میں پھینک دیا جائے۔ رات کا پہر تھا۔ پورے اپارٹمنٹ میں خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ لہٰذا ان کے لیے اپنے کام کو عملی جامہ پہنانا مشکل نہیں تھا پھر بھی احتیاطاً انہوں نے پورے اپارٹمنٹ کا ایک چکر لگایا اور مطمئن ہونے کے بعد اپریل کی ڈیڈ باڈی کو اٹھا کر نیچے لے آئے۔ جد ہر کیون گاڑی لے کر پہلے سے ہی موجود تھا۔

گاڑی ان چاروں میں سے کسی ایک کی تھی۔ انہوں نے مل کر اپریل کی لاش کو کار کی ڈگی میں ڈالا اور پھر کیون آندھی طوفان کی طرح تیزی سے گاڑی کو اڑا لے گیا۔ گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اپنی منزلیں طے کر رہی تھی۔ گاڑی کے اندر اور باہر گہرا سناٹا مسلط تھا۔ وہ پانچوں خاموشی سے محو سفر تھے۔ آبادی بہت پیچھے رہ گئی تھی کچھ دیر بعد کیون نے ایک جگہ پہنچ کر گاڑی کو بریک لگائے۔ رات کی خاموشی میں گاڑی کے ٹائر چیخ اٹھے۔ وہ پانچوں خاموشی سے گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ رات کی کالی چادر اپنی تمام تر خوفناکی کے ساتھ ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ سناٹا ہر سو مسلط تھا۔ شہر سے کافی دور ایک لمبی سڑک تھی۔ جس کے ایک طرف تو کچے پکے کھنڈرات تھے تو دوسری طرف کچرے کا ڈھیر تھا۔

جو نجانے کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔ ان پانچوں نے ڈگی سے اپریل کی لاش نکالی۔ کسی نے اس کا ہاتھ پکڑا تو کسی نے پیروں اور پھر اسے آگے پیچھے جھلانے کے بعد اپنی پوری قوت سے دور کچرے کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ ایسا کرنے کے فوراً بعد ہی آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ابھرنے لگیں جنہوں نے پل بھر میں اپریل کی لاش کو ادھیڑنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد وہ پانچوں وہاں رکے نہیں فوراً سے پیشتر گاڑی میں بیٹھے اور اگلے ہی لمحے گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

اپریل کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا لہٰذا اس کی گمشدگی پر فکر کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ کچھ دنوں بعد پولیس کو ایک کچرے کے ڈھیر پر سے لاوارث ادھڑی ہوئی لاش ملی جو شناخت کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ نجانے وہ کب سے وہاں بے یارومددگار پڑی تھی اور گلی کے کتوں نے اس کا برا حال کر دیا تھا۔ یوں اسے ایک لاوارث لاش جان کر دفنا دیا گیا اور معاملہ رفع دفع کر دیا تھا۔ اس کے بعد کیون نے ایلا سے شادی کر لیا اور وہ چاروں بھی زندگی کے جھمیلوں میں مصروف ہو کر اس واقعے کو بھول گئے۔ انہوں نے اس بات کا ذکر بھی کسی سے نہ کیا۔

ہر کوئی اپنی زندگی میں خوش تھا کہ اچانک سے کیون کو یکے بعد دیگرے ان چاروں کی اموات کی اطلاع ملی جو اس رات اس گھناؤنے کام میں ملوث تھے۔ جس نے کیون کو اضطراب میں مبتلا کر دیا مگر یہ کیفیت بھی وقتی تھی۔ کچھ دنوں بعد وہ پھر سے نارمل ہو گیا اور اپنی حسین بیوی کے ساتھ زندگی کے خوبصورت دن گزارنے لگا مگر یہ خوشی کے لمحے بھی تیا وہ دیر نہ رہے۔

شادی کے ایک سال بعد اچانک سے ایلا کو پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ وہ دن بدن جنونی ہونے لگی یہاں تک کہ کیون بھی مارنے سے گریز نہ کرتی۔ جو سامنے نظر آتا اٹھا کر اس پر پھینک دیتی۔ کیون نے ہر طرح سے اس کا علاج کروایا مگر وہ ٹھیک ہونے کو نہ رہی۔ کیون نے یہ سب کچھ چار سال برداشت کیا اس کے بعد اس نے مجبوراً اسے مینٹل ہسپتال منتقل کر دیا تاکہ اس کا بہتر علاج ہو سکے لیکن وہ وہیں سورگ باش ہو گئی۔

وقت کے ساتھ ساتھ کیون مکمل طور پر ایلا کو فراموش کر چکا تھا۔ ایلا اس کے لیے ایک یاد بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن پھر اچانک سے کئی سال بعد اسے ایک پارسل موصول ہوا تھا جسے کھولنے پر ایک گڑیا اندر سے نمودار ہوگئی تھی۔ جس کی کافی شکل ہو بہو اپریل سے ملتی تھی کیونکہ پارسل پر نہ کوئی نام تھا اور نہ ہی کوئی واپسی کا پتہ۔

یوں جس چہرے کو کیون برسوں پہلے بھلا چکا تھا آج پھر سے وہی اسے یاد آ گیا تھا۔ اب کیون کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ ہو نہ ہو یہ گڑیا نہیں اپریل ہے جو اس روپ میں اس سے انتقام لینے آئی ہے۔ اور اب اس کی باری ہے۔ کیون ساری بات سمجھ چکا تھا۔ کہ اچانک سے صحت مند ایلا دماغ مرض میں مبتلا کیوں ہوئی تھی۔ یقیناً اس کی موت کے پیچھے بھی اپریل کا ہی ہاتھ تھا۔ اس نے جہاں کیون کو غمزدہ کیا تھا کہ اس کی ایلا اس کی غلطی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ وہیں اسے اپریل سے ایک بار پھر شدید نفرت محسوس ہوئی۔ اسے اپریل شروع سے ہی ناپسند تھی۔ وہ زندہ رہ کر بھی کیون کے لیے نقصان کا باعث بن رہی تھی اور مرنے کے بعد بھی......وہ نہ پہے کیون کی جان چھوڑنے پر آمادہ تھی نہ ہی اب۔

غم و غصے سے کیون کا برا حال ہوگیا۔ اس نے شاور بند کیا اور تولیے کی مدد سے گیلا بدن خشک کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے تاول کو جسم کے گرد لپیٹا کہ دفعتاً باہر سے کوئی نسوانی ہنسی ابھری جسے سن کر وہ اپنی جگہ ہی ساکت و جامد ہوگیا۔

وہ اس ہنسی کو بخوبی پہچانتا تھا کیون باتھ روم سے باہر آ گیا۔ اور آہستگی سے چلتا ہوا نیچے ڈرائنگ روم میں آیا۔ جو نہی اس نے ڈرائنگ روم کے اندر قدم رکھا تو اس کی نگاہیں سیدھی گڑیا کی نگاہوں سے جا ٹکرائی۔ خوف کے باعث کیون کی جھرجھری لیکر رہ گیا۔ گڑیا کو دیکھ کر ایک لمحے کو اسے ایسا لگا تھا جیسے گڑیا کے چہرے کے خدوخال بدل گئے ہوں۔ گویا وہ انسانی روپ میں بدل رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں شدید چمک اور زندگی کے آثار تھے۔ کیون کو اب ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ گڑیا نہیں کوئی اور چیز ہے یا پھر کوئی شیطانی چیز۔

اس کا شک یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔ وہ ٹکٹکی لگائے گڑیا کو دیکھتا رہا اور اس کے دل میں یہ احساس جڑ پکڑتا گیا کہ یہ گڑیا نہیں اپریل ہے۔

کیونکہ گڑیا کا چہرہ ہو بہو اپریل سے ملتا تھا۔ وہی آنکھیں وہی چہرہ۔ کیون نے غصے سے آگے بڑھ کر گڑیا کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور تیزی سے چلتا ہوا شو روم میں آیا۔ جس کا دروازہ کھول کر اس نے نفرت سے گڑیا کو اندر پھینک دیا۔ گڑیا باقی پڑے فالتو سامان کے بیچ فرش پر جا گری۔ اس کے بعد کیون نے دھڑام سے دروازہ واپس بند کر دیا اور تیز تیز گہری سانسیں لینے لگا۔ کچھ دیر بعد کیون کے حواس بحال ہوئے تو وہ خود ہی اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوا کہ وہ خوامخواہ ایک گڑیا سے ڈر رہا ہے۔ یہ محض ایک گڑیا ہے۔ جس کا صرف چہرہ اپریل سے ملتا ہے۔ ممکن ہے یہ اس کے ذہن پر چھایا خوف ہے۔ جو اسے گڑیا کی بدلی ہوئی شکلیں دکھا رہا ہے۔ یا پھر اس نے یونہی اپنے دل و دماغ میں اپریل کا خوف بٹھا لیا ہے۔ جبھی تو اسے اس طرح کے وہم ہو رہے ہیں۔ اسے تو مرے ہوئے کافی عرصہ بیت چکا ہے۔ اب اسے آرام کرنا چاہیے۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ نیند میں تو وہ پاگل ہو جائے گا۔

وہ اپنے بیڈروم میں آ کر اسی حالت میں لیٹ گیا اور

لائٹ آف کر دی۔ کیون نے اپنے اوپر چادر اوڑھ کر ایک طرف کو کروٹ بدلی۔ اس کی سوچوں کا رخ ایک بار پھر گڑیا کی جانب چلا گیا۔

"گڑیا کا ایریل سے شکل سے ملنا محض ایک اتفاق ہے۔ بھوت پریت، روح یہ سب فرضی باتیں ہیں۔ اس سے گڑیا کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

کیون یہ سب سوچتا ہوا نجانے کب نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

نجانے وہ رات کا کون سا پہر تھا جب کیون کی یکبارگی آنکھ کھل گئی۔ اسے بالکل سمجھ نہیں آئی کہ اس کی آنکھ کیونکر کھلی تھی۔ تبھی اس کی سماعت سے کوئی جانی پہچانی سی آواز ٹکرائی تو وہ فوراً بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنے کان باہر سے آنے والی آواز پر لگا دیے۔

آواز نیچے ہال سے آرہی تھی اور یہ آواز دروازے کے چرچرانے کی تھی۔ کیون اپنی جگہ ہی ساکت و جامد ہو گیا۔ اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی تھی۔ کب سے ایسی ہی کچھ عجیب سی آوازیں اس کی سماعتوں پر دستک دے رہی تھیں اور اب جا کر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

کیون نے باہر سے ابھرنے والی قدموں کی واضح آواز سنی تھی۔ جس نے اس کے پورے بدن میں خوف و ہراس کی سرد لہریں دوڑا دیں۔ کیون کی نظریں اپنے کمرے کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ جو ادھ کھلا ہوا تھا۔ اور اس کے کان باہر سے آنے والی آوازوں پر مرکوز تھے۔ قدموں کی چاپ دھیرے دھیرے قریب آتی جا رہی تھی۔ اور کیون کا دل بھی زور زور سے اوپر نیچے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر ہی ساکت بیٹھا آنکھیں پھاڑے دروازے سے باہر دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ مگر باہر اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ خود اس کے اپنے کمرے کی لائیٹ بھی آف تھی۔ اور باہر جا کر دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

قدموں کی آوازیں آکر ایک دم سے کیون کے کمرے کے باہر جیسے ختم سی ہو گئی تھی۔ کیون کا دل اس کے سینے میں دھڑک رہا تھا۔ اور سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ وہ ہراساں نگاہوں سے دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا کہ نجانے کس لمحے کیا ہو جائے۔ کیون نے جیسے دروازے کی لکیر کے نیچے نظریں دوڑائیں تو اس کی رگوں میں اس کا خون منجمد ہو گیا۔ وہ دروازے کے نیچے سے کسی کے پاؤں صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ کوئی چھوٹے چھوٹے پیر تھے جو کیون کے کمرے کے باہر کھڑے تھے اور جنہیں دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اور پھر دروازے کی جھری سے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ وہ چہرہ گڑیا کا تھا جسے دیکھ کر کیون کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ گڑیا نے کمرے کے اندر قدم رکھ دیا اور دروازے پر ہی کھڑی ہو کر کیون کو گھورنے لگی۔ گڑیا کی شکل سے نحوست ٹپک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر جو خوبصورت اور پرکشش مسکراہٹ تھی وہ اب نہیں تھی۔ اس کی جگہ شیطانیت نے لے لی تھی۔ گڑیا کو اپنے سامنے یوں دیکھ کر کیون کا سارا خوف اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا۔ وحشت کے مارے وہ اپنی جگہ ساکت و جامد رہ گیا۔ گڑیا کی آنکھوں میں جو پہلے زندگی کے آثار تھے۔ اس وقت وہ بھی دہکتے انگاروں میں تبدیل تھے اور چہرہ بھی بے حد خوفناک تھا۔ کیون کی خوف سے پھٹی آنکھیں گڑیا پر جمی ہوئی تھی۔ جو بے انتہا نفرت و غصے کے تاثرات لیے اسے گھور رہی تھیں۔

کیون کے حلق سے بمشکل ٹوٹے ٹوٹے لفظ ادا ہوئے۔
"ک-----لگ-----ہے-----کیوں-----میرے-----پیچھے-----پڑ-----ی-----ہو؟"
کیون اسے دیکھتا ہوا خوف سے بھرے لہجے میں بولا۔
کیون کے سوال پر گڑیا نے کوئی جواب دیا مگر کیون اسے سن نہ سکا۔ گڑیا کے لب ہل رہے تھے اور وہ گڑیا لے لب پڑھنے سے بھی قاصر تھا۔
وہ کہہ رہی تھی کہ "تم جانتے ہو تم نے کیا کیا ہے؟"
اگلے ہی لمحے جب یہ الفاظ کیون کی سماعت سے ٹکرائے وہ خوف و دہشت کے عالم میں چیخ اٹھا۔
"کیا چاہتی ہو تم مجھ سے۔"
کیون کے پوچھے گئے سوال پر وہ گڑیا اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہوئی کیون کی جانب بڑھنے لگی کیون خوف سے سکڑا سمٹا گڑیا کو اپنے قریب آتا دیکھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ اس کے قریب آ رہی تھی۔ کیون کو اپنا دل بند ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور پھر گڑیا نے اپنی بھاری آواز میں کیون سے کچھ کہا جسے سن کیون کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔
"اب میں تمہیں ڈھونڈ چکی ہوں تو ہم کبھی جدا نہیں ہوں گے۔"
اس کے ساتھ ہی کیون حلق پھاڑ کر چیخ اٹھا۔ جب اسے احساس ہوا کہ وہ اب گڑیا کے نہیں بلکہ اپریل کے روبرو ہے جس کا چہرہ عین کیون کے چہرے کے سامنے تھا۔ یک لخت کیون کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

☆-----☆-----☆

"یہ کب سے ایسی حالت میں ہے۔" ڈاکٹر ہنری نے شیشے کی دیوار سے اندر کمرے میں بیٹھے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جو ہسپتال کے بستر پر بیٹھا خلاؤں میں گھور رہا تھا۔
"پچھلے کافی گھنٹوں سے اسی طرح ہیں۔ کچھ کہتے ہی نہیں ہیں صرف سامنے دیوار کو گھورتے رہتے ہیں۔" پاس کھڑی نرس نے ڈاکٹر ہنری کو بتایا۔
"ہوں۔" ڈاکٹر ہنری دروازہ کھول کر کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔
کیون پچھلے کچھ گھنٹوں سے یہاں موجود تھا۔ فریڈی کے آفس چلے جانے کے بعد گریس کیون کو فون کرتی رہی تھی۔ تاکہ اس کی طبیعت کا پوچھ سکے اور یہ کہ وہ آفس جا رہا ہے یا نہیں-----؟
مگر کیون فون اٹھانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ گریس بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ اور فوراً کیون کے گھر کی جانب چل پڑی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کیون گریس کا فون نہ اٹھائے اور اگر وہ نہیں اٹھا رہا تھا تو یقیناً اس کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔ کیون کے گھر کی دوسری چابی گریس کے پاس تھی۔ وہ گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی اور یہ دیکھ کر اس کی ہوائیاں اڑ گئی کہ کیون بیڈ سے نیچے فرش پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔
گریس نے جلدی سے آگے بڑھ کر کیون کو سیدھا کیا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر فریڈی کو فون کرنے لگی۔ فریڈی آیا اور وہ دونوں مل کر کیون کو ہسپتال لے گئے۔ ہسپتال آنے کے کافی دیر بعد کیون کو ہوش آ گیا تھا مگر تب سے وہ اب تک کسی سے کچھ نہیں بولا تھا۔ چپ چاپ خلاؤں میں گھورے جا رہا تھا۔
"ہیلو کیون-----میں ڈاکٹر ہنری ہوں اور اس وقت آپ

تم ہسپتال میں موجود ہیں۔" ڈاکٹر ہنری نے کہا۔

مگر کیون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مسلسل خالی خالی نگاہوں سے سامنے دیوار کو گھورتا رہا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا۔ جو ڈاکٹر ہنری سننے سے قاصر تھا۔

"کیا تمہیں کچھ یاد ہے کیون کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟" ڈاکٹر ہنری نے پوچھا۔

کیون نے بدستور کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اپنی ہی سیدھ میں جس طرح بیٹھا تھا بیٹھا رہا۔

"تمہاری بہن یہاں ہے۔ میں اسے بلا کر لاتا ہوں شاید تم اس سے بات کر سکو۔" ڈاکٹر ہنری نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

کیون نے ایک بار بھی اسے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ ابھی بھی خالی خالی نگاہوں سے سامنے دیوار کو گھورے جا رہا تھا مگر اب اس کے بڑبڑانے میں مزید تیزی آ گئی تھی اور اس کی آواز بھی پہلے سے زیادہ اونچی ہو گئی تھی۔

"اب جبکہ میں تمہیں ڈھونڈ چکی ہوں تو ہم کبھی جدا نہیں ہوں گے۔"

اگلے ہی لمحے گریس اندر داخل ہو گئی۔ وہ اپنے چہرے پر دلکش مسکراہٹ سجائے ہوئی تھی کیونکہ وہ اپنی پریشانی کیون پر عیاں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے آنسو ضبط کیے ہوئے تھے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف کیے ہوئے تھے شاید کیون کے لیے کوئی تحفہ لیکر آئی تھی جسے وہ اس سے چھپا رہی تھی۔

"کیسے ہو میرے پیارے کیون؟" گریس اس کے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

اس کی آواز میں بھی آنسو تھے مگر وہ خود کو بمشکل سنبھالے ہوئی تھی کیونکہ اس وقت کیون اس کی ضرورت تھی۔ اور وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اس کے ذہن میں وہ تمام باتیں گردش کر رہی تھیں جنہیں وہ کبھی سوچنا نہیں چاہتی تھی اگر آج حالات ایک بار پھر وہی رخ اختیار کرتے جا رہے تھے۔ جیسے ایک سال پہلے اس نے بھائی کو کھویا تھا۔ لیکن وہ اپنے بھائی کو کسی طور کھونا نہیں چاہتی تھی۔

کیون نے جیسے گریس کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ مسلسل سامنے والی دیوار کو دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ وہ بس خاموشی سے سر کو جھکائے ہوئے تھا اور آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے جس کی وجہ سے اس کے پورے بدن میں لرزا تھا۔ گریس نے اسے روتے ہوئے دیکھا تو اس کا دل تڑپ کر رہ گیا۔

"نہیں میری جان رونا نہیں تم تو کافی بہادر ہو اور پھر میں ہوں ناں۔" گریس نے محبت سے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

وہ خود تو کیون کو تسلیاں دے رہی تھی لیکن اندر ہی اندر مختلف سوالات اسے پریشان کیے ہوئے تھے۔ مانا کہ کیون ایلا کے بعد کافی حساس ہو گیا تھا مگر اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ ہلکے سے بخار کو لے کر رونے بیٹھ جائے ضرور کچھ اور معاملہ ہے جسے کیون بتانے سے اور وہ سننے سے قاصر ہے۔

"کیون مجھے بتاؤ ایسی کیا بات ہے جو تمہیں اندر ہی اندر پریشان کر رہی ہے؟ آج صبح جب میں آئی تو تم فرش پر اوندھے منہ پڑے تھے۔ کیا بخار کی زیادہ کی وجہ سے یا پھر.....؟" گریس نے اتنا کہہ کر جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا تا کہ آگے سے کیون کچھ بتا سکے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا مگر وہ جوں کا توں رہا۔ کچھ نہ بولا نہ ہی نظریں اٹھا کر گریس کو دیکھا۔

"کیون پلیز کچھ تو بتاؤ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔" گریس سمجھانے کے سے انداز میں بولی مگر کیون پھر بھی خاموش رہا۔ گریس نے بھی اس کی خراب طبیعت کے پیش نظر زیادہ زور نہ دیا اور یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ کیون ٹھیک ہو کر خود ہی اسے بتا دے گا آخر کو اس کی بہن ہے۔ وہ اسے نہیں بتائے گا تو پھر کسے بتائے گا۔ پھر گریس موضوع بدلتے ہوئے بولی:

"سب باتیں چھوڑو کیون اور یہ دیکھو میں تمہارے لیے کیا لے کر آئی ہوں۔ میں نے تمہارے بیڈ پر پڑے دیکھا اور یقین مانو اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔"

گریس نے یہ کہہ کر کیون کے چہرے کے سامنے چار فٹ کی گڑیا کر دی۔ کیون نے پہلی بار خود نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا تو اپنے سامنے گڑیا نہیں ایپریل کا چہرہ دیکھ کر بے اختیار اس کے حلق سے دل خراش چیخ نکل گئی۔ اسے اچھے سے سمجھ لگ چکی تھی جبکہ ایپریل اس سے کبھی بھی دور نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی وہ اب کبھی ایپریل سے دور ہو سکے گا۔

گریس کیون اس کے اس بری طرح چیخنے پر حیران و ششدر رہ گئی۔ "کیا ہوا کیون؟"

اس نے حیرت و پریشانی کے عالم میں کیون پر سے نظریں ہٹا کر گڑیا کو دیکھا اور یہ جان نہ سکی کہ کیون اسے دیکھ کر اس بری طرح سے کیوں چیخا؟

گریس کی نظر میں تو وہ نہایت خوبصورت اور پرکشش گڑیا تھی جو اس سے پہلے اس کی نظروں میں کبھی نہ آئی تھی۔ گریس کے ہاتھوں میں گڑیا کو دیکھ کر کیون اب مسلسل چیخنے لگا تھا۔ "دور کرو اس کو میری نظروں سے۔۔۔۔ ہٹاؤ اسے۔"

کیون کو اس حال میں دیکھ کر گریس سکتے میں آ گئی اور گڑیا کو کیون سے دور لے گئی۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر ہنری کمرے کے اندر داخل ہوا اور گریس سے بولا:

"میرے خیال میں یہ اچھا ہو گا اگر انہیں آج ابھی سے سائیکاٹرسٹ یا پھر ذہنی امراض کے ہسپتال میں داخل کروا دیا جائے وہاں ان کا بہتر علاج ہو سکے گا کیونکہ یہ دماغی عارضے کی نشانیاں ہیں جن میں سے ایک مظاہرہ آپ بھی دیکھ چکی ہیں۔"

☆.....☆.....☆

مسکرائیے

☆۔۔۔ایک موٹے آدمی کو ڈاکٹر نے کہا "آپ روزانہ دس کلومیٹر پیدل چلا کریں۔" پورے ایک سال بعد ڈاکٹر کو اس آدمی کا ٹیلی فون آیا اور اس نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا "میں دبلا تو ہو چکا ہوں، لیکن افغانستان آ پہنچا ہوں۔ اب آپ بتائیں کہ میں آگے چلوں یا نہیں۔"

(حافظ محمد بلال اکرم۔۔۔سلانوالی)

☆۔۔۔ایک پاگل (دوسرے سے): "آج میں نے بس کے پیچھے دوڑ لگا کر اپنے تیس روپے بچا لیے۔"

دوسرا پاگل: "تم تو پاگل ہو اگر ٹیکسی کے پیچھے دوڑ لگاتے تو تمہارے سو روپے بچ جاتے۔"

(اشتیاق محمد۔۔۔شورکوٹ)

☆۔۔۔باپ (بیٹے سے): "اگر تم اگلے سال میٹرک میں پاس ہو گئے تو میں تمہیں موٹر سائیکل لے کر دوں گا۔" اگلے سال جب امتحان کا نتیجہ آیا تو بیٹا فیل ہو گیا۔ باپ نے بیٹے سے کہا "تم پھر فیل ہو گئے آخر سارا سال تم کرتے کیا رہے ہو؟" بیٹے نے معصومیت سے جواب دیا۔ "میں موٹر سائیکل چلانے کی مشق کرتا رہا ہوں۔"

(ملک اللہ بخش شاہین۔۔۔سلانوالی)

جدوجہد آزادی

تحریر: اطہر اقبال مغل

14 اگست 11947 کا دن ایک یادگار دن ہے، جب بھی یہ دن آتا ہے پاکستان کے لوگ اس کو عید کی طرح سے مناتے ہیں ہر طرف ایک عید کا سماں ہوتا ہے پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعی کوئی خاص دن ہے۔ جس دن ہر بوڑھا جوان بچہ خوش نظر آتے ہیں اور 14 اگست کو بھرپور انداز میں مناتے ہیں 14 ظاہر کرتا ہے کہ واقعی آزادی بھی ایک نعمت ہے۔ جن کو یہ نعمت میسر نہیں وہی جانتے ہیں کہ آزادی کیا ہوتی ہے۔

پاکستان بننے میں کتنا وقت لگا کیا کیا قربانیاں دینی پڑی کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا پاکستان حاصل کرنے کیلئے بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن جو جانتے ہیں ان کو پاکستانی ہونے پر فخر ہے، جب پاکستان بنا تو 14 اگست 1947 کو ہجرت کر کے پاکستان آ رہے تھے سکھوں نے لوٹ مار شروع کر دی اور مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیے ایک کہرام مچا دیا مسلمانوں کا مال اسباب لوٹ لیا بلکہ مسلمانوں کی عزتوں کو بھی پامال کر دیا بہت سے بھائیوں نے یہ منظر دیکھ کر اپنی بہنوں کو اپنے ہاتھوں مار ڈالا کہ ان کی عزت محفوظ ہو جائے بہت باپوں نے بیٹیاں مار ڈالی، اسی طرح بہت سی بہنوں نے بھائی شہید ہوتے دیکھے اور بہت سی ماؤں کے لال ان کی آنکھوں کے سامنے شہید کر دیے گئے بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئی بچے یتیم ہو گئے۔

جو لوگ بچ گئے ان کے پاس کچھ نہیں تھا خالی ہاتھ پاکستان آئے بہت مشکل سے جان بچا کر پاکستان بہت قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا۔ اس کے پیچھے بہت ہی لمبی کہانی ہے پاکستان کو حاصل کرنے میں بہت وقت لگا بہت جدوجہد کی گئی تب جا کر آزادی نصیب ہوئی ایسا نہیں کہ پاکستان پلیٹ میں رکھ کر دیا گیا پاکستان کی تاریخ شہیدوں کے لہو سے لکھی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان بنانے میں مسلمانوں نے بہت قربانیاں دیں، 1857 میں جب مسلمانوں سے ان کا اقتدار چھین لیا گیا تو مسلمان بہت کمزور ہو گئے مسلمانوں کی ساکھ ختم ہو گئی وہی مسلمان جو کبھی حاکم تھے آج وہی غلام بن گئے، ہندوؤں کا خیال تھا کہ شائد اب مسلمان ساری زندگی غلامی کی چکی میں پستے رہیں گے اس لیے ہندوؤں نے انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا اور ہمیشہ مسلمانوں کو نیچا دکھانے کی کوشش کی لیکن مسلمان ایک غیرت مند قوم ہے 1857 کی شکست کے بعد مسلمانوں مجاہد موجود تھے جنہوں نے جدوجہد آزادی کی جنگ لڑی لیکن کامیاب نہیں ہو سکے ان میں سے کچھ شہید ہو گئے اور کچھ غداروں کی وجہ سے گرفتار ہو گئے، کیونکہ برصغیر پاک و ہند میں انگریز کی حکومت تھی۔ اور ہندو انگریزوں کا بھرپور طریقے سے ساتھ دے رہے تھے کیونکہ اب ہندو نہیں چاہتے تھے کہ اب دوبارہ مسلمانوں کی حکومت آئے اور مسلمان دوبارہ صاحب اقتدار ہو اس لیے ہندوؤں کی صدیوں کی نفرت کھل کر سامنے آئی۔

اب مسلمانوں کی حالت بہت کمزور ہو چکی تھی اسی دوران سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو ایک مثبت سوچ دی، جس نے مسلمانوں کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی اور مسلمان قوت

میں آ گئے۔ سرسید احمد خان نے اس دور میں مسلمانوں میں انقلاب برپا کرنے والی سوچ پیدا کر دی اور مسلمانوں کو ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کی تاکید کی، اب مسلمانوں میں بھی اب ایک نئی اور آگے بڑھنے کی سوچ پیدا ہو چکی تھی اور اس پلیٹ فارم سے جدوجہد آزادی کے مجاہدوں نے جنم لیا اور آہستہ آہستہ ایک قوت بن کر سامنے آئے اور انگریزوں اور ہندوؤں کو ایک گہری سوچ میں ڈال دیا اور ان آزادی کے جیالوں نے ہمت نہ ہارتے ہوئے اپنی کوششیں جاری رکھی اور ہندوؤں اور انگریزوں کو بتا دیا کہ مسلمان بھی کوئی قوت ہے۔

مسلمان بھی کسی سے کم نہیں، ان دنوں ہندوؤں کی ایک تنظیم کانگرس کا بہت زور تھا اور یہ جماعت آزادی کیلئے کام کر رہی تھی لیکن یہ جماعت نہیں چاہتی تھی کہ مسلمان اوپر آ ئیں اس کی بد دیانتی کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں نے 1906 میں اپنی ایک جماعت بنائی جس کا نام مسلم لیگ رکھا گیا دیکھتے ہی دیکھتے مسلم لیگ ایک طاقتور جماعت ثابت ہوئی اس جماعت کو مزید طاقت تب ملی جب 1913 میں محمد علی جناح نے اس جماعت میں باقاعدہ شمولیت کا اعلان کیا اور مسلم لیگ کی باگ ڈور سنبھال لی اب مسلم لیگ ایک بہت ہی طاقتور جماعت بن چکی تھی کیونکہ محمد علی جناح نے اس جماعت کو ان کے خوابوں کی تعبیر دی اور مسلم لیگ کو اپنے خواب پورے ہوتے نظر آ رہے تھے جو جدوجہد وہ کافی عرصہ کر رہے تھے۔

اسے آ کر محمد علی جناح نے عملی جامعہ پہنایا اور انگریزوں کو مجبور کر دیا کہ جہاں وہ ہندوؤں کو اقتدار دے رہے ہیں وہاں مسلمان بھی ایک الگ قوم ہے جو کہ اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہے ہندو مسلمان کبھی بھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے اس لیے مسلمانوں کو ایک الگ ملک ملنا چاہیے جس میں ان کو جان و مال کا تحفظ فراہم کیا جا سکے، محمد علی جناح نے اپنے مطالبات انگریزوں کے سامنے رکھ دیے آخر کار انگریز سرکار کو محمد علی جناح کی بات ماننا پڑی اور 23 مارچ 1940 کو ایک قرارداد منظور ہوئی جس کا نام قرارداد پاکستان رکھا گیا اس قرارداد میں بہت سارے مسلمانوں نے شرکت کی، اور آخر کار 14 اگست 1947 کو باقاعدہ طور پر پاکستان وجود میں آیا جس کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی گئی اور پاکستان کو ایک آزاد ملک کی حیثیت ملی، اس لیئے آج ہر پاکستانی اس دن کو بہت ہی جوش و جذبے کو بھرپور طریقے مناتا ہے پاکستان حاصل کرنے میں مسلمانوں نے بہت قربانیاں دی اگر لگن نہ ہوتی تو منزل دور نہیں آج پاکستان کو عالمی شہرت حاصل ہے 14 اگست کا دن یوم آزادی کا دن ہے۔ منزل پا لینے کا دن ہے سکھ کا سانس لینے کا نام ہے۔ 14 اگست کو باقاعدہ تعطیل ہوتی ہے اور پاکستانی پرچم کشائی کی جاتی ہے جو کہ یاد دلاتی ہے 14 اگست 1947 کی اور احساس پیدا کرتی ہے کہ مسلمان ایک آزاد اور زندہ قوم ہے۔

اطہر اقبال مغل

شاہین ڈائجسٹ میں سب سے بہتر پرفارمنس دینے اور ڈائجسٹ کی ترقی کے لیے سب سے اہم کردار ادا کرنے، ڈائجسٹ کے لیے بہتر مشورہ جات اور مواد کی فراہمی میں سب سے نمایاں مقام حاصل کرنے والے ہمارے بھائی اطہر اقبال مغل کے ہم بے حد مشکور ہیں۔ جو اپنے قیمتی وقت میں سے شاہین ڈائجسٹ کے لیے بے پناہ وقت نکال رہے ہیں۔

ایڈیٹر ندیم عباس میواتی

پہلا کالم:

تحریر: خادم حسین

0301-3107786

میرا تعلق بنیادی طور پر صحافت سے ہے۔ مگر ہمارے ایک بزرگ سماجی کارکن حاجی ملک محمد اکرم جو ٹرانسپورٹر بھی ہیں، انھوں نے ٹرانسپورٹروں کی پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے ٹرانسپورٹرز کی ایک ایسوسی ایشن تشکیل دی اور راقم کو دعوت دی کہ اس میں بحیثیت فنانس سیکرٹری اپنی خدمات سرانجام دوں۔ ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میں بھی ان کی ٹیم کا حصہ بنا۔ اور اس تنظیم کا نام آل پنجاب میریہ نصیر پرڈک ڈیپر ایسوسی ایشن رکھا گیا۔ میں نے جب ٹرانسپورٹ کے شعبہ پر ریسرچ کی تو پتا چلا کہ یہ طبقہ پاکستان کے تمام کاروباری حلقوں میں سب سے زیادہ مظلوم ہے۔ تو میں نے سوچا کہ ان کے بارے میں کچھ لکھا جائے۔ ٹرانسپورٹ کا شعبہ ایک ایسا شعبہ ہے جو ملکی معیشت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ انفرادی طور پر ایک ٹرک و ڈمپر کا مالک پاکستان کے کسی بھی کاروباری شعبے سے زیادہ ٹیکس ادا کرتا ہے۔ جو کہ ڈیزل، موبل آئل، سپیئر پارٹس وغیرہ کی خرید پر ٹیکس، ٹال ٹیکس اور ٹوکن ٹیکس کی مد میں سالانہ تقریباً 30 لاکھ روپے کے قریب حکومت پاکستان کو ٹیکس ادا کر رہا ہے۔ اس کے باوجود ٹرانسپورٹر کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ جہاں کے لوگ کوشش کرتے ہیں کہ بچت کر کے زندگی گزاری جائے۔ ملک عزیز کے مختلف محکمہ جات کے زیر استعمال بسیں اور ٹرک جب ناکارہ ہو جاتے ہیں تو محکمہ انہیں نیلام کر دیتا ہے۔ جو غریب ٹرانسپورٹر خرید لیتے ہیں۔

اور وہ ناکارہ ڈھانچہ پاکستان کے ان انجینئرز کے حوالے کر دیتے ہیں جو پاکستان کی کسی یونیورسٹی یا کالج سے فارغ التحصیل نہیں ہوتے۔ بلکہ بچپن میں ہی ان کا غریب باپ یا بیوہ ماں ان کو کسی استاد کے حوالے کر دیتے ہیں کہ استاد جی میرے بچے کو مکینک بنا دو، ڈینٹر بنا دو، الیکٹریشن بنا دو یا رنگ ساز بنا دو۔ پاکستان کی یہ مایہ ناز انجینئرز جو ملک پر کبھی بھی بوجھ نہیں بنتے۔ نہ کسی کالج یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی تربیت پر کوئی سرکاری خرچہ آتا ہے یہ کاریگر عملی کام میں مہارت حاصل کر کے وہ کام کرتے ہیں جو جاپان و جرمنی کے انجینئرز نہیں کر پاتے ہیں۔ یہ نا خواندہ انجینئرز اس پرانے چیسز کو اپنی محنت و مہارت سے دوبارہ نئی زندگی دے دیتے ہیں۔ اور ان میں وہ کیبن اور انجن و گیئر بکس درست کر کے ان گاڑیوں میں فٹ کر دیتے ہیں۔ جن کو جاپان والے ناکارہ سمجھ کے ہمارے ملک میں سکریپ کی شکل میں بھیج دیتے ہیں۔ قابل تحسین ہیں یہاں پڑھ انجینئرز جو اس سکریپ کو نئی جاپانی گاڑیوں کے مقابلے کا تیار کر دیتے ہیں۔ ایک گاڑی کی تیاری پر کم از کم تیس افراد محنت کرتے ہیں جن میں چیسز والے، انجن مکینک، گیئر مکینک، حسر مکینک، آٹو الیکٹریشن، ڈینٹر و رنگ ساز، ڈیکوریشن والے، سیٹ بنانے والے شامل ہوتے ہیں۔ ان عظیم محنت کشوں کی تعداد پورے ملک میں لاکھوں کے قریب بنتی ہے۔ جن کے گھر کے چولہے ان ناکارہ گاڑیوں کے طفیل چلتے ہیں۔ یہ ناکارہ گاڑیاں جب نئی ہوتی تھیں تو ان کے مالکان کسٹم و کسائز ڈیوٹی وغیرہ ادا کر کے ہی گاڑیوں کو روڈ پر لاتے تھے۔

کسٹم ڈیوٹی و مختلف ٹیکسز عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کیے جاتے ہیں۔ ناکارہ انجن اور ناکارہ چیسز کو جو لوگ

دوبارہ تیار کرتے ہیں وہ اپنا اور اپنے خاندان کا بوجھ خود اٹھاتے ہیں۔ حکومت وقت پر بوجھ نہیں بنتے اور بہت ٹرک وڈمپر ان کے ورکر ان کے بچوں کی روزی کا سبب بنتے ہیں۔ عوام کو روزگار مہیا کرنا حکومت وقت کی ذمہ داری ہوتی ہے اگر یہ محنت کش اپنی مدد آپ کے تحت روزی کما رہے ہیں اور حکومت وقت پر بوجھ نہیں بن رہے تو ان کو خراج تحسین پیش کرنا چاہئے نہ کہ ان کو بے روزگار کر دیا جائے۔ اور بے رحم معاشرے کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر یہ پرانے چیسو (کروالی) اور آکشن والی گاڑیاں دوبارہ بننا بند ہو جاتی ہیں تو پورے پاکستان میں لاکھوں ڈرائیور کلینڈرز ٹرانسپورٹرز کے ساتھ ساتھ یہ مکینک حضرات بھی بے روزگار ہو جائیں گے۔ کسٹم حکام کو سوچنا چاہئے کہ یہ پرانی گاڑیاں دوبارہ کارآمد استعمال بنا کر ٹرانسپورٹرز حضرات جہاں ملکی معیشت کو پہیہ چلا رہے ہیں وہیں کروڑوں روپے کا قیمتی زر مبادلہ بھی بچا رہے ہیں۔ کیا یہ زرمبادلہ بچانا قومی خدمت نہیں؟ دوسری طرف محکمہ ایکسائز اور ٹیکسیشن کے ETO حضرات سرکاری فیس لے کر جب گاڑی کی کاپی جاری کرتے ہیں تو پھر کسٹم حکام کا ان گاڑیوں کو پکڑ کر بند کر دینا ٹرانسپورٹرز کے ساتھ سراسر ظلم کے مترادف ہے۔ کیا ضروری ہے کہ ہر ٹرانسپورٹر جاپان سے نئی گاڑی منگوائے اور ملک کا قیمتی زرمبادلہ ضائع کرے، ایک ٹرانسپورٹر اپنی گاڑی کی تیاری پر 50 سے 60 لاکھ روپے خرچ کرتا ہے، وہ سارے کا سارا پیسہ پاکستان میں ہی رہتا ہے۔ جس سے پاکستان کے ہنر مند فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وزارت خزانہ کے حکام سے گزارش ہے کہ کسٹم حکام کو پابند کریں کہ ان گاڑیوں کو چلنے دیا جائے تاکہ ملکی معیشت کا پہیہ چلتا رہے اور ملک میں بے روزگاری کم ہو سکے۔ اتنی لمبی بات کرنے کا مقصد ہے کہ یہ گاڑیاں صرف ٹرانسپورٹرز کو ہی فائدہ نہیں دے رہی بلکہ حکومت وقت کو بھی مختلف مد میں لاکھوں روپے سالانہ ٹیکس ادا کر رہے ہیں۔ جو نقد کی صورت میں ادا ہو رہا ہے۔ جب کہ ملکی صنعت کار اور دوسرے کاروباری حضرات حکومت کو جو ٹیکس دے رہے ہیں وہ سب کے سامنے ہے۔ ایک ٹرانسپورٹ کا شعبہ ہی ایسا ہے جو کمائی بعد میں کرتا ہے ٹیکس پہلے ادا کرتا ہے۔ اور یہ ٹیکس بھی کرپشن فری ہوتا ہے۔ اس لئے حکومت کا فرض ہے کہ اس مظلوم طبقے کی بات سنے اور ان کا تحفظ کرے۔ ٹرانسپورٹرز کے انہی جائز مطالبات کے حل کے لئے ہی آل پنجاب مہر یہ قیصر یہ ٹرک اینڈ ڈمپر ایسوی ایشن کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ تاکہ حکومت وقت سے اور کسٹم حکام سے مل کر ٹرانسپورٹرز کی جائز مشکلات کو حل کیا جا سکے۔

سالگرہ نمبر

تمام قارئین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ شاہین ڈائجسٹ کا اگلا شمارہ سالگرہ نمبر ہو گا۔ شاہین ڈائجسٹ کو اشاعت کی دنیا میں آئے ایک سال مکمل ہو جائے گا۔ جس کی خوشی میں اس سال کے اچھے لکھنے اور مسلسل خدمات سرانجام دینے والے رائٹرز اور دیگر احباب جو بالواسطہ یا بلاواسطہ شاہین ڈائجسٹ کے لیے خدمات سرانجام دے رہے ہیں انہیں اعزازی اسناد سے نوازا جائے گا اور ان کا نام سالگرہ نمبر میں لگا دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ سالگرہ نمبر میں شائع ہونے والی کہانیوں میں پوزیشن حاصل کرنے والی کہانیوں پر بھی اسناد تقسیم کی جائیں گی۔ اس لیے دیر نہ کیجئے اپنا مسودہ آج ہی ہمیں ارسال فرمائیں۔

طالب دعا

محمد ندیم عباس میواتی (ایڈیٹر)

خصوصی محبت نامہ

معافی

زکیر احمد بھٹی

زندگی ایک بہت پیاری نعمت ہے جو ہمیں بار بار نہیں ملتی۔ دنیا میں اس زندگی کا سفر بس ایک ہی بار رہتا ہے اور اس سفر کو کتنا آسان بنانا ہے یہ ہمارے ہاتھوں میں ہے اگر ہم چاہتے ہے کہ ہماری زندگی میں ہر وقت ہر پل خوشیاں ہی خوشیاں ہوں تو ہمیں دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کو بھی یاد رکھنا چاہیے اور ہمیشہ ہی دنیا کے ساتھ چلنا چاہیے نا کہ دنیا سے تیز چلا جائے اور سب سے آگے نکل جایا جائے اور نہ ہی زندگی کے سفر کو اتنی سست رفتاری سے چلنا چاہئے کہ ہم چلتے ہی رہیں اور پھر بھی دنیا ہم سے آگے نکل جائے۔ ایسی دونوں صورتوں میں ہم دنیا سے الگ الگ ہو جاتے ہیں نجانے زندگی میں ہم سے کتنی غلطیاں ہوتی ہے۔

کبھی ہمیں دوسروں سے معافی طلب کرنی پڑتی ہے تو کبھی ہم بھی دوسرے کو معاف کرنا پڑتا ہے اگر ہم چاہتے ہے کہ کوئی ہمیں دل سے معاف کر دے تو ہمیں بھی چاہیے کہ ہم بھی دل سے سب کو معاف کر دیں مگر کبھی کبھی ہم اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہی نہیں ہے بس دوسرے پر الزامات عائد کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہم سوچتے ہے ہماری تو کوئی غلطی ہی نہیں لڑائیاں میاں بیوی کے درمیاں نہیں ہوتی ہیشہ کبھی کبھی ان دوستوں کے ساتھ بھی ہوتی ہے جن کو ہم بہت زیادہ عزیز ہوتے ہے کبھی ہم ان سے الگ نہیں ہونا چاہتے کاش کوئی ایک بار سوچ لے تو پھر کبھی لڑائی جھگڑا ہو ہی نہیں۔ ہر رشتے میں لڑائی کبھی نا کبھی ضرور ہوتی ہے اور میاں بیوی میں تو ضرور کبھی کبھار تلخی آ ہی جاتی ہے لیکن اس کے بعد صلح بھی ہو جاتی ہے۔ اس صلح کے بعد بھی کچھ لوگ ایسے کام کرنے لگتے ہیں۔ جس سے دوبارہ لڑائی شروع ہو جاتی ہے

کچھ لوگ لڑائی کو وقتی طور پر ختم کرنے کے لئے بظاہر صلح کر لیتے ہیں لیکن دل سے وہ اس بات کو نہیں بھلاتے جس کی وجہ سے بہت جلد حالات اسی موڑ پر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں سے وہ شروع ہوئے تھے۔ اگر آپ نے صلح کرنی ہو تو ہرگز مصنوعی صلح مت کریں بلکہ دل سے تمام رنجشوں اور تلخیوں کو نکال کر قدم آگے بڑھائیں۔ معاملے کو ختم کرنے میں ہرگز اپنے ہمسفر پر دباؤ نہ ڈالیں بلکہ معاملے کو ختم ہونے میں تھوڑا سا وقت دیں کیونکہ اس طرح آپ کے ساتھی کا غصہ کم ہو جائے گا اور لڑائی ختم کرنے میں یہ بات معاون ثابت ہوگی۔ مثال کے طور پر اگر ایک ساتھی غصے والا ہو . تو اسے وقت دیں تا کہ اس کا غصہ کم ہو جائے اور پھر با آسانی معاملہ نمٹ جائے گا. اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ ان باتوں پر توجہ مرکوز کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔

جن کی وجہ سے لڑائی شروع ہوئی ہوتی ہے۔ اگر آپ اس غلطی کو دوبارہ نہ دہرانے کی غرض سے سوچ رہے ہیں پھر تو ٹھیک ہے لیکن اگر آپ کے دل میں یہ بات ہے کہ آپ کی تو کوئی غلطی ہی نہیں تھی اور دوسرے نے بلاوجہ اس بات کو لڑائی کی وجہ بنایا۔ ہمیشہ یہ سوچیں کہ وہ غلطیاں دوبارہ نہیں دہرانی جن سے لڑائی ہوئی۔ اگر آپ یہ بات دل میں سوچ کر زندگی گزاریں گے تو پھر امید رکھی جا سکتی ہے کہ دوبارہ لڑائی نہیں ہوگی. معافی مانگ لینے سے کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہو جاتا دل سے معاف کر دینے سے اللہ تعالی کی پاک ذات خوش ہوتی ہے اور معافی کی اہمیت اس لیے بھی بہت ضروری ہے کہ جو ہم سے معافی مانگ رہا ہے وہ ہم سے الگ کبھی بھی نہیں ہونا چاہتا. وہ ہمارے ساتھ رہنا چاہتا ہے معاف کرنے والوں کو اللہ تعالی کی پاک ذات پسند کرتی ہے۔

☆-----☆-----☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



خصوصی محبت نامہ

معصومیت

تحریر: ذکیر احمد بھٹی

انسان جب سے پیدا ہوا ہے ہمیشہ سے بس ایک ہی خواہش رہی ہے کہ اس جہاں میں سب کچھ ہمارے پاس ہو دنیا میں سب سے زیادہ امیر ہم ہی ہوں دنیا کی ہر چیز ہمارے پاس ہو ہم جو چاہیے اپنی زندگی میں خرید سکیں جس طرف بھی ہماری نظر جائے سب سے زیادہ خوشیاں ہمیں ہی ملے مگر افسوس ہے کہ انسان اپنی سوچوں سے باہر نکل کر کبھی نہیں سوچتا اور نہ ہی یہ دیکھنا گوارا کرتا ہے کہ ہمارے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔

لوگ کیسے زندگی گزارنے پر مجبور ہے کس طرح لوگوں کی زندگی گزر رہی ہے۔ آج انسان زندگی کے اس موڑ پر پہنچ گیا ہے سارے دنیا تو بہت دور اپنے گھر کے آس پاس رہنے والوں کی بھی خبر نہیں ہے کہ کون کون اور کیسے کیسے لوگ ہمارے آس پاس رہتے ہیں ان گھروں میں لوگوں کی زندگی کیسے گزر رہی ہے

۔

مجھے ایک بات ہمیشہ یاد رہتی ہے اور وہ وقت میں جب بھی یاد کرتا ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو بھر جاتے ہے۔ گرمی کا موسم تھا اور میں کسی کام سے کہیں جا رہا تھا۔ گرمی اس قدر تھی کہ برداشت سے باہر تھی روڈ خالی تھی بہت کم لوگ تھے جو آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے تو میری نظر ایک چھوٹی سی معصوم سی بچی پر پڑی جو روڈ کے ساتھ چل رہی تھی۔ جب میری نظر اس پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ اس کے پیروں میں جوتے بھی نہیں تھے اور اس کے کپڑے بھی بہت پرانے تھے جیسے کئے دن سے کیا گئی ماہ سے نہ کپڑے دھوئیں ہوں۔ اس کے معصوم سے چہرے پر غریبی کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے اپنی گاڑی کو روڈ کے ایک طرف روک لیا اور گاڑی سے باہر نکل کر اس بچی کی طرف چلتے ہوئے اس کے پاس جا پہنچا اور اس سے کچھ بات کرنا چاہی مگر وہ روڈ کے دوسری جانب چلی گئی۔ مجھے یہ سب بہت عجیب سا لگا میں سوچنے لگا کہ یہ کیا ہے میں تو اس بچی سے بات کرنا چاہتا ہوں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں مگر وہ روڈ کے دوسری طرف چلی گئی میں نے اس آواز دی تو اس نے بس میری طرف ایک نظر دیکھا اور چلتی ہوئی کچھ شاپر کو اکٹھا کرتی ہوئی اپنے چھوٹے سے ہاتھوں میں پکڑی ایک بوری میں ڈالنا شروع کر دیا۔

جب زمین پر پڑے کچھ شاپر اکٹھے کر کے بوری میں ڈال لیا تو واپس میری طرف آئی اور میرے نزدیک آ کر روک گئی میں اس کی طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے اس بات کی تو وہ بیچاری معصوم سی بچی کچھ نہ بولی تو میں نے اس سے اس کے حالات کے بارے بات کی تو اس بچی کا جواب سن کر میرا دل کر رہا تھا کہ میں اپنی گاڑی کو آگ لگا دوں اور اتنی اونچی اونچی آواز میں چلانا شروع کروں کہ میری آواز حکومت تک پہنچ جائے بچی اپنی توتلی سی زبان میں بول رہی تھی۔

جب بچی نے کہا کہ انکل میرے ابو اس دنیا میں نہیں ہے۔ میری امی بہت بیمار ہے اور ایک چھوٹا سا بھائی ہے جب اسے بھوک لگتی ہے تو وہ بہت روتا ہے۔ ہمارے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہوتا تو میں روڈ سے سارا دن یہ پرانے شاپر اکٹھے کر کے ایک انکل کے پاس لے جاتی ہوں وہ مجھے تھوڑے سے پیسے دے دیتا ہے تو میں بھائی کے لئے اور امی کے لئے روٹی

لے کر گھر چلی جاتی ہوں تو بھائی روٹی کھا کر چپ ہو جاتا ہے۔
جب میں نے اس بچی سے اس کے پیروں میں جوتوں کے بارے پوچھا تو اس نے کہا انکل میری امی کہتی ہے کہ جب میں ٹھیک ہو جاؤں گی تو اپنی پری کو نئے جوتے لے کر دوں گی ابھی ایسے ہی گزارا کر لے میری بچی ..اس کے جواب نے میرے دل کو ہلا کر رکھ دیا۔

بچی کو جب میں نے کہا کہ میرے ساتھ میری گاڑی میں چل میں تجھے نئے جوتے بھی لے کر دیتا ہوں اور آپ کی امی کی دوائی بھی لے کر دیتا ہوں مگر اس بچی نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ انکل میری امی نے منع کیا ہے کہ روڈ سے دوسری طرف نہیں جانا اور نہ ہی کسی کی گاڑی میں بیٹھنا ہے اور نہ ہی کسی کے گھر جانا ہے۔میں یہ بات سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اب میں کیا کروں میری دماغ میں بس یہی بات آئی کہ میں گاڑی کو یہاں ہی رہنے دوں اور اس بچی کے ساتھ اس کے گھر جاؤں ۔ایسا کرنے کے علاوہ میرے پاس کوئی حل بھی نہیں تھا۔

گاڑی کو لاک کرنے کے بعد میں بچی کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا تو اس بچی کی ماں سے ملا تو اس نے گھر کی کچھ صورتحال بتائی کہ میرے شوہر کے انتقال کے بعد خاندان نے ہم کو الگ کر دیا۔میرے پاس تعلیم نہیں۔جس کی وجہ سے میں کسی جگہ کام بھی نہیں کر سکتی اور بیماری کی وجہ سے کوئی گھر میں کام ہوتا نہیں۔جس کی وجہ سے میری معصوم سی بچی دن بھر روڈ سے کچھ شاپر جمع کر کے فروخت کر کے کچھ پیسے گھر لے آتی ہے ۔جس سے ہم لوگ اپنے پیٹ کی آگ کو بجھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ان کی باتوں سے میری آنکھیں مسلسل آنسوؤں سے بھر گئی اور جو بھی میرا سے ہوا وہ کر کے واپس اپنی راہ پر چلنے لگا۔یہ سب دیکھنے کے بعد میری ان امیروں سے درخواست ہے کہ ان سب کو چاہیے کہ ہم زیادہ نہیں تو کم از کم اپنے ارد گرد کے لوگوں کا ہی خیال رکھتا کہ ہمارے ملک سے غربت کا خاتمہ ہو سکے۔

اللہ پاک نے اگر دیا ہے تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ بھی کرنا چاہیے۔

سوہنی دھرتی

سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے
جب تک ہے یہ دنیا باقی ہم دیکھیں آزاد تجھے
تیرا ہر اک ذرہ ہم کو اپنی جان سے پیارا
تیرے دم سے شان ہماری تجھ سے نام ہمارا
جب تک ہے یہ دنیاباقی ہم دیکھیں آزاد تجھے
سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے
تیری پیاری سج دھج کی ہم اتنی شان بڑھائیں
آنے والی نسلیں تیری عظمت کے گن گائیں
جب تک ہے یہ دنیاباقی ہم دیکھیں آزاد تجھے
سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے
بستی بستی چرچا قدم قدم پہ گیت ترے
دھڑکن دھڑکن پیارے ہے تیرا گھر گھر میں میت ترے
جب تک ہے یہ دنیا باقی ہم دیکھیں آزاد تجھے
سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آزاد تجھے
جب تک ہے یہ دنیا باقی ہم دیکھیں آزاد تجھے

انتخاب:عبدالمعز۔۔۔۔۔کوٹ ادو

ملک این اے کاوش اعوان (چیف ایڈیٹر) سہ ماہی شاہین ڈائجسٹ سرگودہا محمد ندیم عباس میواتی (ایڈیٹر)



نوکِ قلم

الحاج محمد بشیر شاد
bashirshad47@yahoo.com

دوسرا کالم:

"بڑے آئے فلاسفر"

کالم نگار: چوہدری محمد بشیر ۔۔۔۔۔شاد ایتھنز یونان

چھت میں نصب کون سی مقناطیسی قوت تمہاری گردن میں خم نہیں آنے دے رہی۔۔۔

تو تم پھر وارد ہو گئے ہو ناگہانی آفت بن کر۔۔۔

نہ آتا تو مکڑی کے جالے کی مانند لا متناہی الجھنوں کے حصار میں مقید تمہارا وجود جامد ہو جاتا۔

اور تم اس جامد وجود کا بت بنا کے کسی چوک میں سجا کر اپنی دوستی کا دم بھرتے۔۔۔۔

پھر فلسفیانہ باتیں۔۔۔۔!!

فلسفہ علم و آگہی کا موضوع ہے تم کیا جانو۔۔۔

ہاں نصف سال آسمان کو دیکھو اور باقی ایام زمین پہ نظریں جمائے رکھو یہی ہے تمہارا فلسفہ۔۔

فلسفہ کو تعریفی کوزے کی زندان میں پابند کرنا ممکن نہیں ۔ازمنہ قدیم سے اس کے دائرہ کار کا گوشوارہ متعین نہ کیا جا سکا اور تم، نہیں نہیں، یہ تمہاری بساط سے باہر ہے۔

ہم ٹھہرے ہوق، اب تم ہر روز کی طرح کہو گے فلسفہ کے معنی ہیں، بال کی کھال اتارنا،،

جب تک باریکی میں نہیں جاوٴ گے کچھ پلے نہیں پڑے گا۔یہ ہمہ گیر علم جو ہر وجود کے اغراض و مقاصد کی ماہیت کے لازمی اور ابدی جزویات کی نشاندہی کرتا ہے افلاطون نے اس کی تصدیق کی۔۔۔۔!!

اوہ یار۔۔۔تم اب داستان چھیڑو گے۔۔۔

سنو ابھی ارسطو سے بات ہوئی کہہ رہا تھا،، وجود بذات خود اپنی فطرت میں کیا ہیں اس سے پردہ اٹھانے کا نام فلسفہ ہے۔

تمہاری بے تکی باتیں سننے کے لئے میں ہی رہ گیا ہوں سناتے جاوٴ۔

کانٹ فلسفہ کو ادراک و تعقل کے انتقاد سے تعبیر کرتا ہے۔

میرا خیال ہے آج تمہارے ذہن کی نس نس فلسفہ کے بحر بیکراں کی گہرائیوں کو ناپ رہی ہے۔

ہاں درست کہا، فلسفہ ام العلوم ہے ریاضی، طبعیات، کیمیا، منطق، نفسیات، معاشرتی علوم جیسے تمام علوم کا منبع و ماخذ۔۔

تمہاری اس منطق کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آسکی، تم رہو اپنے بھنور میں، میں چلتا ہوں۔۔۔

یہ چلنا بھی فلسفہ میں شامل ہے۔۔دیکھا تمہاری فطرت سے الگ بات ہوئی تو تم چلنے پہ آمادہ ہوئے۔۔۔

میں دو گھونٹ پانی حلق میں اتار لوں تو باقی بات سنتا ہوں آج سنا ڈالو احمقانہ باتیں۔

یہ پانی بھی ایچ ٹو او کا محلول ہے یعنی دو حصے ہائیڈ روجن اور ایک حصہ آکسیجن ایک خاص حرارت پہ جا کے پانی کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔۔۔فلسفہ ہی تو اس کا اظہار کرتا ہے۔مابعد الطبعیات، علمیات، اخلاقیات، منطق اور جمالیات سب اس کے مرہون منت ہیں۔

کیا کہا جمالیات؟

ہاں یہ تمہارے مزاج کے مطابق ہے،کائنات کی تخلیق،عناصر، نور وظلمت،اور حرکت وتغیر کے تمام پہلوؤں سے حسن کی دلکشی کی جھلک کسی قوت کی نشاندہی ہے۔

غیروں کا دم بھرتے رہو گے اپنوں کا فلسفہ کیا ہے؟

کندی، فارابی، ابو سینا، امام غزالی اور شعرانی نے بھی فلسفہ کو اجاگر کیا ہے۔

کسی نے سیاسی انا رچڑھاوکی بات بھی کی ہے یا اسے فلسفے گول کرگئے؟

سقراط کوجانتے ہو۔

جہاں اتنے فلاسفروں سے تمہاری ہر روز ملاقاتیں ہوتی ہیں انہی میں سے کوئی ایک ہوگا۔

ہاں یہ تھا،،جمہوریت کا علمبردار،،

کیا کیا جمہوریت کے لئے اس نے؟

اس نے نظام جمہوریت کی بقا کی خاطر زنداں میں زہر کا پیالہ پینے کو ترجیح دی اور جابر حاکم وقت کی مراعات ٹھکرا دیں۔

اگر ایسے فلاسفروں کو تم مقدم رکھتے ہو تو تم بھی بڑے بیوقوف ہو۔۔۔۔

مجھے پتہ تھا تم مجھے یہی کہو گے لیکن پاگل تم ہو جو اس کی خطا کرو جمہوریت کا بظاہر پرچار تو کرتے ہو لیکن اندرونی خلفشار کی پیروی کرتے ہوئے تم جمہوریت کی نفی کے اسباق پہ کاربند منافقت پہ عمل پیرا ہو۔

تمہارا پڑھ پڑھ کے دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔تم سے بہت کم پڑھے لکھے وزیر بن گئے اور تم ہمارے مشیر تک نہ بن سکے۔رکھو اپنے پندونصائح کے ابواب اپنے پاس،،بڑے آئے فلاسفر،،

☆-----☆-----☆

آزادی کے ستر سال

ان سالوں میں پائی راحت
بڑھی دلوں میں حب اور چاہت
بن گیا دیس ہمارا جنت
کر گئے قوم مری خوش حال
بے زر کو بھی مال ملا ہے
جو چاہ ہر حال ملا ہے
خوشحالی سے ملا مال
آزادی کے ستر سال
پاکستان نے پائی عزت
پاکستان نے پائی عظمت
پائی ایم بم کی طاقت
اپنے آپ میں بڑے کمال
آزادی کے ستر سال
ایک نے دیکھا خواب اس کا
ایک نے کھولا باب اس کا
بخت نا مہتاب ہے اس کا
یاد ہیں قائدؒ اور اقبال
آزادی کے ستر سال
خوشحالی سے ملا مال
آزادی کے ستر سال

☆-----☆-----☆

محمد ندیم عباس میواتی-----ایڈیٹر

☆-----☆-----☆

بابا ڈلا

تحریر: محمد ضیاء اللہ زاہد ۔۔۔۔ شجاع آبادی

0301-4793530

یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب میں لاہور میں فیروز پور روڈ پر واقع ایک مدرسہ میں پڑھ رہا تھا۔ ایک دن ہم دوستوں نے مینار پاکستان کے سائے میں کچھ وقت گزارنے کا ارادہ کیا، چنانچہ ہم تین دوست اپنے ساتھ کچھ ریفریشمنٹ کا سامان لے کر سہ پہر تین بجے مینار پاکستان کے قریب جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم سے کچھ فاصلے پر کوئی پانچ چھ نوجوان اور آ بیٹھے اور لڈو پر جا کھیلنے لگے۔ ایک کے بعد دوسری گیم ابھی شاید جاری ہی تھی کہ دور سے ایک بوڑھے پر نظر پڑتے ہی ان میں سے ایک نے کہا بابا ڈلا اور فوراً ہی وہ اٹھ کر دوڑنے لگے۔ بابے کو غصے میں دیکھ کر ہم بھی خوف زدہ ہوئے کہ کہیں یہ بابا ہمیں کوئی چیز اٹھا کر نہ مارے لیکن ہم اپنی جگہ بیٹھے رہے اور بابے کی حرکات دیکھتے رہے۔ بابا کے چہرے پر غصے کے ساتھ ساتھ دکھ کے بھی آثار نظر آ رہے تھے۔ شاید اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے تھے جنہیں وہ بار بار آستین سے پونچھ رہا تھا۔

بابے نے ایک تیکھی نظر ہم پر ڈالی اور پھر ہم سے تھوڑی دور مینار پاکستان کی دوسری طرف جا بیٹھا۔ ہم تجسس کے مارے بابے کو انکھیوں سے دیکھتے رہے۔ اب بابے نے خود سے باتیں شروع کر دیں۔ اگرچہ ہم اس کی باتوں کو واضح طور پر نہیں سن سکتے تھے تاہم ہمیں اتنا معلوم ہوا کہ جیسے وہ کسی سے شکایت کر رہا ہو، کچھ دیر بعد یہ شکایت التجا میں بدل گئی اور ہم نے دیکھا کہ بابے نے اپنی قمیص کے نیچے کمر پر بندھا کوئی کپڑا کھولا اور اسے اپنی آنکھوں سے لگا کر رونے لگا اور پھر روتے روتے بابے کی ہچکی بندھ گئی۔ ہم سے بابے کا اس طرح رونا برداشت نہ ہوا تو ہم اٹھ کر بابے کے قریب جا بیٹھے، لیکن بابا اپنے غم میں اس قدر نڈھال تھا کہ جیسے اسے کچھ ہوش نہ ہو۔

آخر کار جب کافی دیر انتظار کر کے ہم تھک گئے تو جیسے ہی میں نے اپنا ہاتھ بابے کے کندھے پر رکھا، بابا ایک دم گھبرا کے پیچھے کو ہوا اور ہماری طرف دیکھ کر غصے سے بولا کون ہو؟ میں نے بابا سے پوچھا کہ بابا جی خیریت تو ہے، آپ کیوں رو رہے ہیں؟ بابا جی نے کہا بیٹا یہ لوگ مجھے باولا سمجھتے ہیں، ہاں واقعی میں باولا ہوں۔ میں اور میرے سب دوست باولے ہیں جو آزادی کی تحریک کا حصہ بنے۔ قائد اعظم نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت تشکیل دے رہے ہیں جس کی بنیاد لا الہ الا اللہ ہوگی، ایک ایسی ریاست حاصل کرنا چاہتے ہیں جس میں لوگ قرآن و سنت کے مطابق زندگیاں بسر کریں گے، ایک ایسی سلطنت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

جس میں طاقت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہوگی اور ہم اس کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنی زندگیاں گزاریں گے۔ قیامت کے دن میں قائد اعظم سے پوچھوں گا کہ کیا انہوں نے ہمیں بیوقوف بنایا تھا؟ ہمیں قائد اعظم نے جھوٹی تسلیاں کیوں دیں؟ میں پوچھوں گا، ضرور پوچھوں گا۔ بیٹا جب پاکستان کی تحریک چلی تو اس وقت میری عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ پاکستان کے بننے سے دو سال پہلے میری شادی ہوئی۔

ہم انبالہ کے رہنے والے اچھے خاصے زمیندار تھے۔ میں نے اپنے دوستوں کے ہمراہ پاکستان کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔

ہم اپنے علاقے میں ہر روز پاکستان کے حق میں جلسے کرتے اور لوگوں کو بتاتے کہ دو قومی نظریہ کیا ہے؟ ہندو ؤں کے ساتھ ہم کیوں نہیں رہ سکتے؟ ہم کہتے تھے کہ پاکستان کا حصول ہی ہماری آزادی کی ضمانت ہے، نہیں تو ہندو ؤں نے انگریزوں سے بڑھ کر ہمارا جینا مشکل کر دینا ہے۔ پھر جب پاکستان بن گیا تو میں بھی لاکھوں لوگوں کی طرح خاندان سمیت پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والوں میں تھا۔

راستے میں جتنی مصیبتیں ہم نے برداشت کیں وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ یہ قمیض کا ٹکڑا میری بہن فاطمہ کا ہے جسے سکھوں نے میرے سامنے بے آبرو کیا۔ میری بیوی کیسرا کو میرے سامنے نیزے کی انیوں میں پرو دیا۔ میرے ابو جی کو سر پر لٹھ مار مار کے شہید کر دیا۔ میں تمام رشتے داروں سے بچھڑ گیا اور ادھ موا ہو کر پاکستان میں پہنچ پایا۔ میں جب پاکستان پہنچا تو بہت خوش ہوا کہ اب میں اس ملک میں پہنچ گیا ہوں جہاں کا قانون اسلامی قانون ہوگا اور جہاں خلافت راشدہ جیسا مثالی ماحول دیکھنے کو ملے گا۔ لیکن بیٹا آج پاکستان کو بنے ہوئے ساٹھ سال ہونے کو ہیں اور وہ دیکھو سامنے وہ چوبارے جو نظر آ رہے ہیں ناں، ان چوباروں میں راتوں کو عصمتوں کی سر عام نیلامی ہوتی ہے۔ عصمتیں بیچنے والی اور خریدنے والے سب کلمہ پڑھنے والے ہوتے ہیں۔ ادھر دیکھو یہ بازار ہیں یہاں بھی بے حیائی اور فحاشی عام ہے کوئی عورت گزرنے لگے تو لوگ ایسی للچائی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے کتے گوشت کو دیکھتے ہیں۔

مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ یا تو یہ قائد اعظم کا پاکستان نہیں ہے یا پھر کم از کم یہ وہ پاکستان ہرگز نہیں جس کی بنیاد لا الہ الا اللہ تھی۔ بیٹا جب میں ان لوگوں کو اپنے دکھڑے سناتا ہوں اور انہیں پاکستان کا مقصد سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں تو یہ مجھے باولا، دیوانہ، پاگل اور پتا نہیں کیا کیا کہتے ہیں۔ ہاں واقعی شاید میں باولا ہوں کہ میں اس ملک میں لا الہ الا اللہ کی حکمرانی اور محمد رسول اللہ ﷺ کے قانون کی بات کرتا ہوں۔ شاید میرے علاوہ وہ سب لوگ بھی دیوانے ہیں جو دن رات اس ملک میں اسلامی قانون کی بات کرتے ہیں اور شاید وہ بھی لوگ بھی میری طرح بیوقوف بن رہے ہیں جو ہر وقت دین اور مذہب کی رٹ لگاتے رہتے ہیں۔ بیٹا! میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ تم بھی انہیں دیوانوں کا ساتھ دو ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ اس ملک میں قرآن و سنت کا قانون ہوگا کیوں کہ یہ قائد اعظم کا وہی پاکستان ہے جو اس نے اسلام کے نام پر حاصل کیا۔

اے ارض پاک وطن تیری فضاؤں میں
رچی ہے خوشبو لہو کی، مرے شہیدوں کے
کبھی تو پائیں گے اہل وطن اساس تری
جلا کے رکھتے ہیں سارے دیے امیدوں کے

روز قیامت خوشحالی لوگوں کی خواہش

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"قیامت کے دن ان بندوں کو جو دنیا میں مبتلائے مصائب رہے ان مصائب کے عوض اجر و ثواب ملے گا تو وہ لوگ جو دنیا میں آرام و چین سے رہتے رہے وہ حسرت کریں گے کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں۔ (زہرا بتول ۔۔۔۔ آزاد کشمیر)

جنت کا راستہ صراطِ مستقیم

محمد ضیاء اللہ زاہد شجاع آبادی

اھدنا الصراط المستقیم کی دعائیں ہر مومن مرد و عورت کا وردِ زباں ہیں۔ ہر مسلمان کی یہی آرزو، یہی جستجو اور یہی تگ و دو ہے کہ کچھ ایسا کر گزرے کہ خدا کی بارگاہ میں سرخرو ٹھہرے کامیابی و کامرانی اس کا مقدر اور جنت الفردوس اس کا انعام ٹھہرے۔ اسی آرزو کو لے کر کوئی دیوبندی ٹھہرا تو کوئی بریلوی، کوئی اہلِ حدیث ٹھہرا تو کوئی سنی، کوئی صوفی ٹھہرا تو کوئی پیر۔ غرض کہ سب کے راستے تو جدا جدا ہیں لیکن مقصد ایک ہے جبکہ اس مقصد کے حصول کی کلید خدائے بزرگ و برتر نے قرآن مجید میں ہی "ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی" میں بیان فرما دی۔

افسوس صد افسوس کہ آج امت نے اللہ کے بتائے راستے کو چھوڑ کر الگ الگ پگڈنڈیوں پہ چلنا شروع کر دیا۔ اسی المیہ کو اقبال نے یوں بیان کیا:

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

آج بھی اگر کوئی سچے دل سے اخروی کامیابی کا متلاشی ہے تو اسے اس طریقہ، اس راستہ اور اس طرزِ عمل کی طرف مراجعت کرنا ہوگی کہ جسے قرآن نے اسوۂ حسنہ سے معنون کیا۔ اسوۂ حسنہ ایک مکمل طرزِ زندگی کا نام ہے جس میں سونے جاگنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، آنے جانے، معاشرت، معاشرت غرض کہ ہر ایک عمل میں راہنمائی ہے۔ اسوۂ حسنہ جنت کے راستے کا نام ہے۔

اسوۂ حسنہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

نقشِ قدم نبی کے ہیں جنت کے راستے
اللہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے!

اسوۂ حسنہ کامیابی کا واحد ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ؟ کوئی بھی طریقہ، کوئی بھی عمل قابلِ قبول نہیں چاہے وہ کتنا ہی بھلا دکھائی دیتا ہو۔ کسی بھی عمل کا سنت سے میل کھانا اس کی قبولیت کی سند ہے۔ سنت عمل دین کا حصہ ہے۔

خدا ہر اک عمل پہ دیکھتا مہرِ رسالت ہے
بنا اس کے کوئی بھی ہو عمل اس میں ضلالت ہے

صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین کی زندگیاں کس طرح سنت کا پرتو ہیں؟ کس طرح صحابہ رسول ﷺ نے سنت کی اور اسوۂ حسنہ پیروی کی؟ صحابہؓ کے قلوب میں چھوٹی سے چھوٹی سنت کی کتنی قدر و منزلت تھی؟! اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنگ کی طوالت کو مسواک ترک کرنے کا باعث سمجھا گیا اور پھر اس چھوٹی سی سنت کو اپنانے پر فتح حاصل ہوگی۔ یہی سنت کی عظمت ہے۔ لیکن افسوس کہ آج غیروں نے ہمارے ہاتھ میں برش تھما دیا اور مسواک جیسی سنت سے محروم کر دیا۔

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی!

سنت اور بدعت ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ ہر وہ عمل جو سنت سے ثابت شدہ نہیں وہ بدعت ہے۔ اس کو رسم و رواج تو کہا جا سکتا ہے لیکن کوئی بھی ذی فہم اس کو سنت نہیں کہے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ راہبر کے روپ میں چھپے راہزن کے نزدیک اس کی قدر دوام سے اہمیت دی جائے یا واجبات کہا جائے لیکن حقیقت یہی ہے کہ خدائے تعالیٰ نے دین کی تکمیل فرما دی۔ اب کوئی بھی عمل دین کا حصہ نہیں ہو سکتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے

آخری وقت امت کو راہ سنت اختیار کرنے کی وصیت فرمائی اور بدعت سے بچنے کی نصیحت فرمائی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانہ جہالت کے تمام رسوم و رواج کو پاؤں کی نوک پر رکھا۔ تمام رسوم و رواج کو باطل قرار دیا، لیکن افسوس کہ آج امت مسلمہ راہ سنت کو ترک کر کے رسوم و رواج کے تابع ہو گئی۔ آج ہماری خوشی، غمی، شادی بیاہ، کفن دفن ہر ایک عمل میں سنت کو تانوی حیثیت اور رسوم و رواج کو فوقیت دی جاتی ہے اسی دکھ کو اقبال نے اس طرح بیان کیا:

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پچھلی امتوں کے بہتر فرقے ہوئے جبکہ میری امت کے تہتر ہوں گے اور ان میں سے نجات صرف ایک کا مقدر ٹھہرے گی۔ صحابہ رضی اللہ عنھم نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کون سا فرقہ ہوگا جو نجات پائے گا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو فرقہ اس راستے پر چلا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے راہ سنت ہی کو راہ نجات فرمایا۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ روز محشر ہم سرخرو ہوں، کامیاب ہوں اور نجات یافتہ ہوں تو پھر ہر کام کرنے سے پہلے ہمیں تحقیق کرنا ہو گی آیا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنھم نے یہ کام کیا کہ نہیں؟ اگر انہوں نے وہ کام نہیں کیا تو وہ کس طرح دین ہو سکتا ہے؟ وہ کس طرح نجات دہندہ عمل ہو سکتا ہے؟

آج ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا مولوی، پیشوا اور امام کیا کہہ رہا ہے، یہ نہیں پرکھتے کہ وہ جو کہہ رہا ہے کیا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی وہ کیا یا نہیں، یہ نہیں سوچتے کہ جو ہم کر رہے ہیں کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے بھی وہ عمل کیا یا نہیں؟

آج کوئی بھی عشق رسول کا دعوی کر کے ہم سادہ لوح مسلمانوں کو جس راستے پہ چاہے لے کے جا سکتا ہے۔ آج کوئی بھی عشق رسول کا دعوی کر کے ہمارے ایمان سے کھلواڑ کر سکتا ہے کیوں کہ ہمارے نزدیک ایمان کا معیار صرف دعوی عشق ہی ہے۔

اگر ہم اپنے ایمان کی کسوٹی سنت رسول اور صحابہ کے طرز عمل کو بنائیں تو صرف اسی صورت میں ہی ہماری حقیقی کامیابی اور ہمارا مقدر جنت ہو گی۔

اقوال زریں

☆......مصائب سے مت گھبرایا کریں کیوں کہ ستارے اندھیرے میں چمکتے ہیں۔

☆......اگر تم ہنستے ہو تو تمہارے ساتھ پوری دنیا ہنسے گی اور اگر تم روتے ہو تو تمہیں اکیلے ہی رونا پڑے گا۔

☆......محبت ایک ایسا طلسمی چراغ ہے جو اندھیرے سے روشنی کی طرف اور روشنی سے اندھیرے کی طرف لے جاتا ہے۔

☆......جو بات تم دشمن سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہو وہ دوست سے پوشیدہ رکھو۔

☆......انسان کی تکمیل تین چیزوں سے ہوتی ہے۔ خوف، امید اور محبت۔ خوف گناہ سے بچاتا ہے۔ امید اطاعت پر آمادہ کرتی اور محبت میں محبوب کی رضا کو دیکھنا پڑتا ہے۔

☆......عقل مند انسان مستقبل کی اس طرح حفاظت کرتا ہے جیسا کہ وہ حال ہو

عائشہ طالب......گوجرانوالہ

قافلے سعادت کے

تحریر محمد ضیاء اللہ زاہد شجاع آبادی

یہ کئی سو سال قبل مسیح کی بات ہے ایک بندۂ توحید واللہ کے حکم سے مقام ابراہیم پر یا صفاء پہاڑی پر یا جبل ابوقبیس پر کھڑے ہو کر ندا کرتا ہے کہ لوگو! تمہارے رب نے اپنا ایک گھر بنایا ہے پس تم اس کا حج کرو۔ پہاڑ جھک گئے اور اس بندۂ خدا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز ساری دنیا میں گونج گئی۔ یہاں تک کہ باپ کی پیٹھ اور ماں کے پیٹ میں جو تھے، انہیں بھی سنائی دی۔ ہر پتھر، درخت اور ہر اس شخص نے جس کی قسمت میں حج کرنا لکھا تھا با آوازِ بلند لبیک پکارا۔ چنانچہ پوری دنیا سے انسانیت مصائب و آلام برداشت کر کے اس مقدس مقام پر حاضری کو اپنا شرف اور اعزاز سمجھتی ہے۔

ہزاروں سال گزرنے کے باوجود اس امن کے گہوار؟ شہر میں لوگوں کی آمد کا سلسلہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اس دوران کئی ایسے بدبخت بھی آئے جنہوں نے وہاں پر جانے والوں کو روکنے کے طاغوتی منصوبے بنائے لیکن وہ اپنے ان ناپاک عزائم کے حصول میں ناکام ہوئے اور اس راہِ سعادت پر گامزن فرزندانِ توحید کے قافلے ہمیشہ پہلے سے زیادہ اس عظیم مرکزِ عشق و تجلیات پر حاضر ہوتے رہے اور تا قیامت حاضر ہوتے رہیں گے۔

اس سال بھی ہر سال کی طرح راہِ عشق و وفا کے قافلے خراماں خراماں بارگاہِ الٰہی میں پروانہ وار چلے آ رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ خداوند رحمان و رحیم اپنے فضل و عنایت سے ان نحیف و کمزور بازوؤں کی جگہ پر لگا دے تو اڑ کر اس مرکزِ رشد و ہدایت کو جانے والے عظیم راستوں، گلیوں اور بازاروں کی اپنے ابرو؟ں سے صفائی کروں اور پھر جب راہِ سعادت پر گامزن یہ قافلے گزرنے لگیں تو اپنی پلکیں فرشِ راہ کروں تاکہ ان قدسیوں کے احرام و اجسام گرد آلود نہ ہوں۔

مملکتِ خداداد پاکستان سے ایسے خوش نصیب فرزندانِ توحید کے قافلوں کی 26 جولائی سے روانگی جاری ہے۔ اسی طرح پوری دنیا سے عشقِ الٰہی میں غوطہ زن اہلِ ایمان کے قافلے وادیٔ غیر ذی زرع کی طرف روانہ ہونے والے ہیں۔ پھر لاکھوں نفوس پر مشتمل یہ مجمع جس میں مختلف رنگ، نسل، زبان اور علاقوں کے لوگ ایک ہی لباس میں، ایک ہی میدان میں جمع ہو کر یک زبان ایک ہی نغمہ، نعرۂ توحید و لبیک اللھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک، ان الحمد والنعم؟ لک والملک لا شریک لک

حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں، بے شک تمام تعریفیں اور نعمتیں تیری ہی ہیں اور ملک بھی تیرا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں

گنگناتا بارگاہِ الٰہی میں اپنی حاضری لگواتا ہے اور پھر کبھی میزابِ رحمت کے سائے میں بیٹھ کر تو کبھی مقامِ ابراہیم پر مناجات کرتا ہے، اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت کی بھیک مانگتا ہے۔

حج کے ارکان میں قدم قدم پر سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام، سیدنا اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی یادیں تاز؟ ہوتی ہیں۔ صفاء و مروہ پر سعی کے وقت ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوتی ہے اور حاجی سوچتا ہے کہ واہ حضرت ہاجرہ تیرا دوڑنا بھی اللہ کو اتنا پسند آیا کہ قیامت تک آنے والی انسانیت کیلئے اللہ نے لازم قرار دے دیا۔ اس وقت

حاجی اپنے آپ کو حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے ہمراہ تصور کرتا ہے اور ایسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی حضرت ہاجرہؓ کے ساتھ پیارے اسماعیل کیلئے پانی کی تلاش میں کبھی تیز دوڑتا ہے تو کبھی آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ قربانی کے وقت تو گویا حاجی کے دل میں ایمان کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مستانہ وار حکمِ الٰہی کو پورا کرنے کیلئے تیار ہیں اور اسماعیل علیہ السلام کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر چھری تیز تیز چلا رہے ہیں۔ کیا ہی منظر ہے کہ افلاک پر ملائکہ حیرت سے تکے کہ اس انسان کو دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح اللہ کی خوشنودی کے حصول کیلئے اپنی اکلوتی اولاد کو ذبح کر رہا ہے۔ غرض کہ طوافِ قدوم، طوافِ وداع، استلامِ حجرِ اسود، سعی، وقوفِ عرفات، مبیتِ مزدلفہ (مزدلفہ میں شب باشی)، وقوفِ مشعرِ حرام، قیامِ منٰی، رمی جمرات، حلق وقصر اور قربانی جیسی عبادات کو بجالانے کے بعد ایک حاجی جو گناہوں کا پشتارہ لادے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوتا ہے اس سے آزاد ہو چکا ہوتا ہے اور اگر اس نے کوئی بیہودہ بات یا گناہ نہیں کیا تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کی رو سے اس طرح گناہوں سے پاک ہو چکا ہوتا ہے گویا کہ اسے اس کی ماں نے آج ہی جنا ہے۔ حدیث مبارکہ میں ہے کہ "الحج المبرور لیس لہ الجزاء الا الجنۃ" کہ حج مبرور کا بدلہ جنت ہی ہے۔

قافلے سعادت کے تحریر: محمد ضیا عاقلہ زاہد شجاع آبادی یہ کئی سو سال قبل مسیح کی بات ہے ایک بندۂ خدا اللہ کے حکم سے مقامِ ابراہیم پر یا صفا پہاڑی پر یا جبل ابوقبیس پر کھڑے ہو کر ندا کرتا ہے کہ لوگو! تمہارے رب نے اپنا ایک گھر بنایا ہے پس تم اس کا حج کرو۔ پہاڑ جھک گئے اور اس بندۂ خدا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز ساری دنیا میں گونج گئی۔ یہاں تک کہ باپ کی پیٹھ اور ماں کے پیٹ میں جو تھے، انہیں بھی سنائی دی۔ ہر پتھر، درخت اور ہر اس شخص نے جس کی قسمت میں حج کرنا لکھا تھا با آواز بلند لبیک پکارا۔ چنانچہ پوری دنیا سے انسانیت مصائب و آلام برداشت کر کے اس مقدس مقام پر حاضری کو اپنا شرف اور اعزاز سمجھتی ہے۔ ہزاروں سال گزرنے کے باوجود اس امن کے گہوارہ شہر میں لوگوں کی آمد کا سلسلہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اس دوران کئی ایسے بدبخت بھی آئے جنہوں نے وہاں پر جانے والوں کو روکنے کے طاغوتی منصوبے بنائے لیکن وہ اپنے ان ناپاک عزائم کے حصول میں ناکام ہوئے اور اس راہِ سعادت پر گامزن فرزندانِ توحید کے قافلے ہمیشہ پہلے سے زیادہ اس عظیم مرکزِ عشق و تجلیات پر حاضر ہوتے رہے اور تا قیامت حاضر ہوتے رہیں گے۔

اس سال بھی ہر سال کی طرح راہِ عشق و وفا کے قافلے خراماں خراماں بارگاہِ الٰہی میں پروانہ وار چلے آ رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ خدا احد رحمان و رحیم اپنے فضل و عنایات سے ان نحیف و کمزور بازوؤں کی جگہ پر لگا دے تو اڑ کر اس مرکزِ رشد و ہدایت کو جانے والے عظیم راستوں، گلیوں اور بازاروں کی اپنے ابرو ؤں سے صفائی کروں اور پھر جب راہِ سعادت پر گامزن یہ قافلے گزرنے لگیں تو اپنی پلکیں فرشِ راہ کروں تا کہ ان قدسیوں کے احرام و اجسام گرد آلود نہ ہوں۔ مملکتِ خداداد پاکستان سے ایسے خوش نصیب فرزندانِ توحید کے قافلوں کی 26 جولائی سے روانگی جاری ہے۔ اسی طرح پوری دنیا سے عشقِ الٰہی میں غوطہ زن اہلِ ایمان کے قافلے وادیٔ غیر ذی زرع کی طرف روانہ ہونے والے ہیں۔ پھر لاکھوں نفوس پر

مشتمل یہ مجمع جس میں مختلف رنگ، نسل، زبان اور علاقوں کے لوگ ایک ہی لباس میں، ایک ہی میدان میں جمع ہو کر بیک زبان ایک ہی نغمہ نعرۂ توحید و لبیک اللھم لبیک، لبیک لاشریک لک لبیک، ان الحمد والنعمۃ لک والملک لاشریک لک حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں، بے شک تمام تعریفیں اور نعمتیں تیری ہی ہیں اور ملک بھی تیرا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں گنگنا کر بارگاہ الٰہی میں اپنی حاضری لگواتا ہے اور پھر کبھی میزاب رحمت کے سائے میں بیٹھ کر تو کبھی مقام ابراہیم پر مناجات کرتا ہے۔

اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت کی بھیک مانگتا ہے۔ حج کے ارکان میں قدم قدم پر سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام، سیدنا اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی یادیں تازہ ہوتی ہیں۔ صفاء و مروہ پر سعی کے وقت ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوتی ہے اور حاجی سوچتا ہے کہ واہ حضرت ہاجرہ تیرا دوڑنا بھی اللہ کو اتنا پسند آیا کہ قیامت تک آنے والی انسانیت کیلیے اللہ نے لازم قرار دے دیا۔

اس وقت حاجی اپنے آپ کو حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے ہمراہ تصور کرتا ہے اور ایسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی حضرت ہاجرہ کے ساتھ پیاسے اسماعیل کیلیے پانی کی تلاش میں کبھی تیز دوڑتا ہے تو کبھی آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ قربانی کے وقت تو گویا حاجی کے دل میں ایمان کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مستانہ وار حکم الٰہی کو پورا کرنے کیلیے تیار ہیں اور اسماعیل علیہ السلام کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر چھری تیز تیز چلا رہے ہیں۔ کیا ہی منظر ہے کہ افلاک پر ملائکہ حیرت سے مٹی کے اس انسان کو دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح اللہ کی خوشنودی کے حصول کیلیے اپنی اکلوتی اولاد کو ذبح کر رہا ہے۔

غرض کہ طواف قدوم، طواف وداع، استلام حجر اسود سعی، وقوف عرفات، مبیت مزدلفہ (مزدلفہ میں شب باشی)، وقوف مشعر حرام، قیام منیٰ، رمی جمرات، حلق قصر اور قربانی جیسی عبادات کو بجا لانے کے بعد ایک حاجی جو گناہوں کا پشتارہ لادے ہوئے بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوتا ہے اس سے آزاد ہو چکا ہوتا ہے اور اگر اس نے کوئی بیہودہ بات یا گناہ نہیں کیا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کی رو سے اس طرح گناہوں سے پاک ہو چکا ہوتا ہے گویا کہ اسے اس کی ماں نے آج ہی جنا ہے۔ حدیث مبارکہ میں ہے کہ "الحج المبرور لیس لہ الجزاء الا الجنۃ" کہ حج مبرور کا بدلہ جنت ہی ہے۔ حج کے بعد جہاں ایک پروانۂ توحید خالق کائنات کے دربار میں حاضری کی سعادت سے مشرف ہوتا ہے وہاں اس کے دل میں حبیب خدا کے روضۂ اقدس پہ حاضر ہو کر عجز و انکساری کے ساتھ امام المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے یاران باوفا حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کو سلام عرض کرنے کی تڑپ بھی شمع محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کا روپ دھار چکی ہوتی ہے اور وہ سید المرسلین کے روضۂ انور پر حاضری کیلیے بے چین ہوتا ہے تاکہ وہاں سے شفیع عاصیاں کی شفاعت کی سند بھی حاصل کر لے۔

یہی تقاضۂ عشق ہے کہ وہ رحمۃ اللعالمین پیغمبر جو اپنی امت کے غم میں زندگی بھر اتنا رویا کہ کبھی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے خشک نہیں ہوئیں اس کے پاس جا کر سلام عرض کیا جائے۔ توحید خالق کائنات کے دربار میں حاضری کی سعادت سے مشرف

ہوتا ہے وہاں اس کے دل میں حبیب خدا کے روضۂ اقدس پہ حاضر ہو کر عجز و انکساری کے ساتھ امام المرسلین ﷺ ؟ اللہ علیہ و سلم اور آپ کے یاران باوفا حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کو سلام عرض کرنے کی تڑپ بھی شعلۂ جوالہ کا روپ دھار چکی ہوتی ہے اور وہ سید المرسلین کے روضۂ انور پر حاضری کیلئے بے چین ہوتا ہے تا کہ وہاں سے شفیع عاصیاں کی شفاعت کی سند بھی حاصل کر لے۔ یہی تو عشق ہے کہ وہ رحم ؟ العالمین پیغمبر جانِ امت کے غم میں زندگی بھر اتنا رویا کہ کبھی اس کی آنکھیں آنسو ؤں سے خشک نہیں ہوئیں اس کے پاس جا کر سلام عرض کیا جائے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی ہمیں بھی بیت اللہ کی بار بار زیارت نصیب فرمائے اور ہمیں بھی ان خوش نصیب قافلوں کے ساتھ سفر کی سعادت عطا فرمائے۔ آمین!

شیطان کے بھاگنے کا سبب

ایک شخص جنگل میں جا رہا تھا کہ شیطان بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس شخص نے دن بھر ایک نماز نہ ادا کی یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ شیطان سے بھاگنے لگا۔

سبب پوچھا تو شیطان بولا:

"میں نے عمر بھر صرف ایک بار آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا تو ملعون قرار پایا۔ تو نے آج پانچوں نمازیں ترک کر دیں۔ مجھے خوف آ رہا ہے اگر تجھ پر قہر نازل ہوا تو میں بھی اس قہر کا شکار نہ ہو جاؤں۔

اقصیٰ عائشہ قادری ----- گوجرانوالہ

☆-----☆-----☆

میری آنکھوں سے ایک دم آنسو نکل پڑے-----؟

ایک مرتبہ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ جو کہ نو مسلم تھا، نماز پڑھنے مسجد میں گیا-----میں عصر کی آدھی نماز پڑھ کر تھوڑی دیر میں باہر آ گیا۔ لیکن اسے وہاں سے باہر آنے میں یوں گھنٹہ لگ گیا۔

میں حیران تھا کہ یہ شخص میرا اتنا بھی خیال نہیں کر سکا۔ مجھے باہر کھڑا کر گیا ہے-----میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ میرے پاس آیا اور انتہائی شرمندگی اور عاجزی سے کہنے لگا-----

اصل میں تم لوگوں نے بچپن سے اللہ کا ذکر سنا ہوتا ہے، مسلمان گھر میں پیدا ہوتے ہو اس لیے تمہیں نماز پڑھتے ہوئے اللہ کا تصور ذہن کو یکسو کر کے یہ کیفیت لانے میں کہ ایسے لگے جیسے میں اللہ کے حضور کھڑا ہوں-----آپ مہربانی کر کے مجھے کوئی ایسا طریقہ بتا دیں کہ میں جلدی سے اللہ کے حضور میں اپنے آپ کو یکسو کر سکوں۔"

میری آنکھوں سے ایک دم آنسو نکل پڑے، شرم سے میرا سر جھک گیا، میرے دامن میں اپنے ایمان کی کمتری کے سوا کچھ بھی نہ تھا-----!!

اوریا مقبول -----دریا خان

☆-----☆-----☆

آخر ایسا کیوں ہے......؟

تحریر: اظہر اقبال مغل

انسان اشرف المخلوقات ہے۔جس میں قدرت نے دنیا کو بدلنے کی صلاحیت پیدا کی ۔جب سے دنیا وجود میں آئی ہے انسان نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس دنیا کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔جہاں انسان میں یہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں، وہاں بہت ساری خامیاں بھی پائی جاتی ہے۔انسان کا حساب بالکل ایک مشین کی طرح ہے۔جب کبھی مشین میں کوئی نقص یا خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔تو یہ مشین اُس وقت تک ٹھیک طرح سے کام نہیں کرتی جب تک اس خرابی کو دور نہ کیا جائے۔

اسی طرح انسان میں بھی کئی طرح کی خرابیاں یا نقص پیدا ہو سکتے ہیں لیکن ان خرابیوں کو دور کر کے انسان ٹھیک ہو سکتا ہے۔لیکن انسان میں کچھ نقص ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہ نظر نہیں آتے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ نقص خطرناک حالت اختیار کر جاتے ہیں۔ان میں جو سب سے قابل ذکر ہے وہ ذہنی مرض ہے جو کہ عام لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ایسے لوگوں کا علاج کوئی میڈیشن نہیں بلکہ ان کی اصلاح ہوتی ہے۔

جو کہ عام معاشرہ میں رہنے والے لوگ نہیں کرتے۔جس سے یہ مرض شدت اختیار کر جاتی ہے اور مریض اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔آپ نے دیکھا ہو گا سڑکوں پر اس طرح کے کتنے ہی لوگ ہیں جو کہ اس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں۔کوئی ان پر توجہ دینے والا نہیں۔بلکہ ان پر توجہ دینے کے بجائے ان کا علاج کرانے کے بجائے ان کی اصلاح کرنے کے بجائے اکثر لوگ ان کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ان سے چھیڑ چھاڑ کر کے بہت سے لوگوں کو سکون ملتا ہے۔

کوئی اُن کے بارے میں نہیں جاننا چاہتا کہ یہ کون لوگ ہیں کہاں سے آئے ہیں، کیا یہ پیدائشی طور پر ہی ایسے پیدا ہوئے تھے یا کہ وقت اور حالات نے ان کو ایسا کر دیا ہے۔شائد اس ہجوم میں جہاں سب اپنی اپنی ذات میں مگن ہیں کوئی ان کے بارے میں نہیں جاننا چاہتا۔ایک بات دیکھنے میں آئی ہے جہاں انسان انسان کے کام آتا ہے۔ایک دوسرے کیلئے جان دیتا ہے وہاں انسان ہی انسان کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔اور انسان ہی انسان کی جان لیتا ہے۔جس کی زندہ مثال یہی لوگ ہیں جو کہ لوگوں ہی کے ستائے ہوئے ہوتے ہیں اور لوگ بجائے ان کی اصلاح کرنے کے ان کو اس قدر ذہنی اذیت دیتے ہیں ان کی ذہنی حالت ہی بگڑ جاتی ہیں۔

ہمارا معاشرہ بجائے ان کو پیار دینے کے بجائے ان کی اصلاح کرنے کے ان سے یا تو نفرت کرتا ہے یا ان کا مذاق اُڑاتا ہے۔سڑک پر پڑے کسی شخص کے بارے میں اگر تحقیق کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کو اس حالت پر پہنچانے والا کوئی اور نہیں بلکہ ابن آدم یا بنت حوا ہی ہے۔کسی کو کسی لڑکی نے پیار میں دھوکا دیا تو اس کی یہ حالت ہو گئی۔کوئی اپنے بھائی بہنوں کی وجہ سے اس حالت تک پہنچا ہے۔

کسی کو دوست نے دھوکا دیا اس کی بیوی چھین لی کاروبار چھین لیا یا اس کی ذہنی حالت ذرا کمزور ہوئی اور اس معاشرے نے اس کا اس قدر مذاق اُڑایا تو اس کی یہ حالت ہو گئی۔اور وہ ہمیشہ کیلئے گمنام زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا۔ایسا ہرگز نہیں کہ ان لوگوں کا علاج ناممکن ہے۔یہ لوگ ٹھیک ہو سکتے ہیں اگر ان کو

پیار دیا جائے، ان سے محبت سے پیش آیا جائے، ان کا مذاق نہ اُڑایا جائے، ان کو پتھر نہ مارے جائیں، ان کو کم تر ہونے کا احساس نہ دلایا جائے۔ لیکن جب کسی شخص کی یہ حالت ہوتی ہے تو ہم یا تو اس کو پاگل خانہ میں چھوڑ آتے ہیں یا پھر سڑکوں پر کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔

یا ایسے انسان کا کھانا پینا الگ کر کے ان کو زنجیر سے باندھ دیتے ہیں۔ آج تک کبھی کسی نے دیکھا کہ کسی پاگل نے کسی کو قتل کیا ہو کسی سڑک پر رہنے والے نے کسی کی جان لی ہو۔ ہمیشہ ایک ہوش مند انسان ہی قتل کرتا ہے، ایک ایسا انسان جو کہ خود کسی کا شکار ہوا ہے وہ کسی کی کیا جان لے گا اگر اس نے جان ہی لینی ہوتی تو سب سے پہلے اس کی لیتا جس نے اس کو اس حالت تک پہنچایا ہے۔ یہ لوگ پیدائشی پاگل نہیں ہوتے اس لیے اگر ان کا بروقت علاج کرایا جائے اور ان پر توجہ دی جائے تو یہ لوگ نارمل انسان بن سکتے ہیں لیکن ہماری بدقسمتی ہم لوگ ایسے لوگوں پر بالکل بھی توجہ نہیں دیتے بلکہ ان کو اذیت پہنچاتے ہیں۔ ان کو الٹے ناموں سے پکارتے ہیں اصل میں دیکھا جائے تو پاگل وہ لوگ نہیں ہیں اصل پاگل ہم نارمل انسان ہیں جو عقل و شعور رکھنے کے باوجود ان لوگوں پر توجہ نہیں دیتے، ان کی اصلاح نہیں کرتے، آج پاکستان میں کتنے ہی ادارے انسانوں کی فلاح بہبود کے لیے کام کر رہے ہیں۔

کیا کوئی ایسا ادارہ یا کوئی ایسی این جی او ہے جو کہ ان لوگوں کیلئے کام کر رہا ہو آخر ہیں تو یہ لوگ بھی انسان۔ ہو سکتا ہے ان پر ہماری تھوڑی سی توجہ سے یہ لوگ نارمل ہو جائیں۔ کیا یہ ان لوگوں پر ظلم نہیں ہے قیامت والے دن ہم لوگوں سے نہیں پوچھا جائے گا ہم نے ان لوگوں کیلئے کیا۔ اگر ہم ان لوگوں کیلئے کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم ان کو اپنی مرضی سے تو زندگی گزارنے دیں آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ کوئی ایسا انسان کسی کی دوکان کے سامنے لیٹا ہو تو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے اس کو بھگانے کیلئے اس پر پانی پھینکا جاتا ہے اسے دھکے مارے جاتے ہے کچھ لوگ تو گندی گندی گالیاں دینے سے بھی گریز نہیں کرتے آخر ایسا کیوں ہے ایک انسان کا ایک انسان سے ایسا سلوک کیوں ہے؟

غازی علم الدین شہید

4 دسمبر 1908ء کو شہید ناموس رسالت ﷺ غازی علم الدین پیدا ہوئے۔ 1926ء میں لاہور کے ایک کتب فروش راج پال نے رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکات کے متعلق ایک نازیبا کتاب شائع کی تھی جس کا نام ہی ایک مسلمان کا خون کھولانے کے لیے کافی تھا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد مسلمانوں نے ہندوستان بھر میں راج پال کے خلاف احتجاج کیا۔ راج پال گرفتار تو ہوا لیکن قانونی سقم کی وجہ سے رہا ہو گیا۔ 6 اپریل 1929ء کو علم دین، راج پال کی دکان پر پہنچے اور نہایت سکون سے اسے واصل جہنم کر کے خود گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ غازی علم الدین پر راج کے قتل کے الزام میں مقدمہ چلا اور ہائی کورٹ نے انہیں موت کی سزا سنا دی۔ 31 اکتوبر 1929ء کو میانوالی جیل میں ان کی سزائے موت کے حکم پر عمل درآمد کیا گیا۔ 6 نومبر 1929ء کو انہیں لاہور میں میانی صاحب کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

ملک این اے کاوش۔۔۔۔چیف ایڈیٹر
آن لائن شاہین ڈائجسٹ سرگودہا

پھول جب مرجھائے...

بنت عبدالخالق ------ ملتان

آفت کے پرکالے ... مر ہی کیوں نہیں جاتے .. وانیہ نے مکمل غصے میں ہکلاتی زبان کے ساتھ ... کول مول عکاشہ کو بد دعا دی...

ارے بہو ... کتنی مرتبہ کہا ہے کہ سوچ سمجھ کے بات منہ سے نکالا کر... بوڑھی ساس نے تسبیح کے دانے گراتے ہوئے کہا...

پاس پڑے گلاس سے پانی کا گھونٹ بھرا اور گویا ہوئیں...

قبولیت کا وقت بھی ہوتا ہے"...

بوڑھی ساس کا ابھی اتنا کہنا تھا کہ بہو صاحبہ اپنے کندھے پر جھولتے بالوں کو جھٹکا دے کر ساس کی طرف رخ بدل چکی تھی....

آپ کو تو بس باتیں کرنا اور باتیں بنانا آتا ہے ... بچے سنبھالنا پڑیں تو پتہ چلے....؟؟ وانیہ کے چہرے سے پہ ایک رنگ آرہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا....

وانی ... بری بات.... اتنے میں اسلم کہیں سے آ ٹپکے....

اسلم نے بس اتنا کہنے پہ اکتفا کیا تھا، کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ اگر اس نے کچھ زیادہ کہہ دیا تو بم گولے کا رخ اس کی طرف ہو جائے گا....

یہ بچے اتنا تو تنگ کرتے ہیں، آپ کو تو ذرا احساس بھی نہیں ۔ تب کہہ رہی مرنے کی بد دعا دیتی ہوں ... وانیہ نے خود کو مظلوم ثابت کرنا چاہا...

☆-----☆-----☆

وانی ... میں قربانی کے لیے جا رہا ہوں ... دانیال کو اٹھا لو .... اسلم نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا...

دانیال کو رہنے دیجئے مگر عکاشہ کو اپنے ساتھ لے جائیں ...

وانیہ نے دو سالہ دانیال کو اٹھانے کے لیے ہاتھ پھیلائے...

عکاشہ کو.... اسلم نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا...

ہاں ... عکاشہ کو ہی ... وانیہ نے ایسے جواب دیا، جیسا اس نے اسلم کی حیرانی کو محسوس نہ کیا ہو...

ابھی عکاشہ چھوٹا ہے ... وہاں خون وغیرہ ہوگا تو عکاشہ....؟؟

اسلم ساڑھے چھ سالہ عکاشہ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ وانیہ نے بات کاٹی...

یہ سب تو لے جانے کے بہانے ہیں ... وانیہ نے جل کر کہا....

نہیں ہرگز نہیں ... یہ چھوٹا ہے، اگر کوئی اول فول حرکت کر دی تو....؟؟ اسلم نے پریشان ہوتے ہوئے کہا...

بہو .... قربان گاہ میرے شہزادے کو بھیجو ... کہیں ڈر نہ جائے"...

ساس صاحبہ نے نہایت نرم اور پیار بھرے لہجے میں کہا...

مگر وانیہ نے اپنی ساس کی بات کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا...

حالانکہ وہ کسی بات کو نظر انداز کرنے والی نہ تھی .... شاید کہ وہ آج عید کے دن ساس سے بحث نہیں کرنا چاہتی تھی...

یہ گدھا بہت تنگ کرتا ہے ... مر کیوں نہیں جاتا...

☆-----☆-----☆

بنت عبدالخالق ------ ملتان

☆-----☆-----☆

سوچ کا در

تحریر: نیلہ خان ----ڈیرہ اسماعیل خان

کوڑے کی بدبو سے پورے گھر کی فضاء متعفن تھی ۔آتے جاتے سب جمعدار کی عزت افزائی ضرور کرتے جو پچھلے تین دن سے غیر حاضر تھا اور گھر میں کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ کوڑے دان کو باہر کوڑے کے ڈرم میں خالی کر کے اس بدبو سے جان چھڑا لی جاتی کیونکہ یہ کام ان سب کی شان کے خلاف تھا۔

ماما پلیز ماسی کو ہی کہ دیں کہ یہ کوڑا باہر دفع کر آئے۔گھر میں آتے ہی بدبو استقبال کرتی ہے۔حسن نے جل کر فرزانہ کو مخاطب کیا۔وہ ابھی ٹیوشن پڑھا کر آیا تھا اور آتے ہی بدبو نے اسکی طبیعت کو مکدر کر دیا۔

بیٹا آج بھی کہا تھا ماسی کو مگر وہ بے چاری تو اپنا وزن بھی بمشکل اٹھا پاتی ہے اس بھاری بھرکم ڈسٹ بن کو کیسے اٹھائے گی ۔اچھا کر دیتی ہے مگر کام ختم کر کے کھسکنے کو تیار ہوتی ہے۔جانے میں ایسی تیزی دکھاتی ہے کہ کتنے کام کروانے والے رہ جاتے ہیں۔پھر اگلے دن تک کام اس کے انتظار میں پڑے رہتے ہیں۔فرزانہ نے اپنا رونا رویا۔تب تک حسن بھی اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔بچوں کی بے حسی پہ کڑھتے ہوئے فرزانہ پھر سے الماری ٹھیک کرنے لگی جو حسن کے آنے کی وجہ سے بیچ میں ہی رہ گئی تھی۔

خدا خدا کر کے چوتھے دن جمعدار کی شکل نظر آئی تو فرزانہ تیزی کے ساتھ گیٹ کھول کر اسکی کلاس لینے کے خیال سے اسکے مقابل آتے ہوئے ڈانٹنے والے انداز میں اس سے مخاطب ہوئی۔کوڑے والے بھائی تمہیں پتا بھی ہے روز کا کتنا کوڑا جمع ہو جاتا ہے۔کوڑے کی بدبو نے الگ دماغ خراب کر رکھا ہے اوپر سے تم لوگوں کی چھٹیاں ہی ختم نہیں ہوتیں۔پیسے لینے کے لیے تم ہر ماہ کی پہلی تاریخ سے پہلے ہی دماغ چاٹنے لگتے ہو۔لو بھلا بتاؤ تو صحیح کہ ایسا کیا ضروری کا پڑ گیا کہ اکٹھی تین تین چھٹیاں کرنی پڑ گئیں؟فرزانہ نے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے اچھا خاصا غصے کا اظہار کر دیا۔

باجی تین دن کے لیے میں تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ سہ روزہ لگانے گیا تھا۔باجی نوکری کرنا تو میری مجبوری ٹھہری کیونکہ پیٹ کا دوزخ بھرنا ہے مگر کچھ حق تو میرے رب کا بھی ہے جس نے ہمیں اپنے خوبصورت مذہب سے روشناس کروایا۔جمعدار نے سر جھکا کر اپنی غیر حاضری کی وجہ بتائی تو فرزانہ کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ منہ بھی کھلا رہ گیا۔

☆-----☆-----☆

ساون کی یادیں

تحریر: وقاص عمر

0341-1401028

دل پریشان ہے۔آنکھیں نم ہیں۔کچھ ذہن میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔ان کٹھن لمحات میں مجھ سے الفاظ نہیں لکھے جا رہے۔میرا قلم میرا ساتھ نہیں دے رہا۔

کمرے کی ہلکی سی روشنی میں اپنے چاہنے والے قارئین کی ان گنت محبتوں کا سمندر سامنے پھیلائے کھڑکی کے اس پار دھیرے دھیرے غروب ہوتے ہوئے آفتاب کو دیکھ رہا ہوں۔ اور یہ جو دل جو روئے چلا جا رہا ہے جانے کیوں اتنی بے شمار محبتوں کا سمندر سامنے پا کر بھی اداسی کے قلعے سے باہر نہیں آ رہا۔

ساون رت اور اڑتی ہوئی پروا، ٹوٹا ہوا دل ہے۔ساون کی راتیں اور ان پر بارشوں کا یہ موسم۔دل میں بسنے والے ادھورے خواب کچھ ان دیکھے خواب کچھ، کچھ دیکھے بھالے خواب اور ان خوابوں کی تعبیر کی تلاش میں میرے سرد ہوتے ہوئے جذبات کب سے ہیں۔ان کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں مگر کوئی بھی تو نہیں جو میرے ان خوابوں کو حقیقت کی راہ دکھائے۔

میری بجھتی ہوئی آنکھوں میں روشنی کے دیپ جلائے مگر نہیں وہ اور اب تو زندگی میں یہ احساس ہونے لگا ہے کہ اپنا کوئی بھی نہیں ہے۔اب تو بے چارہ دل تڑپ اٹھتا ہے اور پھر خیالوں میں ہی لاکھوں باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے۔مگر ٹوٹا ہوا دل کچھ بھی نہیں کر پاتا اور پھر ساری باتیں دل کی دل میں ہی رہ جاتی ہیں۔نظروں کی چمک دل میں بہاریں لے آتی ہیں اور اپنی سانسوں کو بھی چین مل جاتا ہے۔لیکن جب نظریں ہی اداس ہو جائیں تو سانسیں تڑپانے لگتی ہیں اور پھر دل ہی دل کو تڑپانے لگتا ہے۔بس اس لمحے میں بھی اپنی اداس نظروں اداس دل، اداس سانسوں کو رلاتے ہوئے خود کو تڑپاتے ہوئے کئی یادوں کو دل میں سمائے ہوئے میں کیوں اس کے انتظار میں ہوں جو میرا نہیں ہے۔میں کیوں پیاسا ہوں، نہیں کبھی سکا میں ادھا اور ادھا اور ادھورا ہی ہوں کبھی کبھار تو سانسیں بھی بوجھل ہو جاتی ہیں۔ایسے میں چاہتیں بھی بوجھل بھی زخم ہو جاتی ہیں۔

کبھی دل بھی تو دھڑکنا بھول جاتا ہے۔وقت کبھی نہیں رکتا موسم بھی بدلتے رہتے ہیں لیکن محبت نہیں بدلتی۔ہمیشہ دلوں میں زندہ رہتی ہے۔میں ستاروں کو اس مٹھی میں نہیں سجا سکتا۔میرے ہاتھوں میں ستارے اچھے نہیں لگتے۔میرے دل کے سپنوں اور دکھوں کو کوئی نہیں سجا سکتا۔

شاید کوئی میری خواہشوں کو امر کر دے۔میرا مقدر مجھ سے برہم ہے۔ساون کا مہینہ ہے۔محبت کا موسم ہے۔مگر جہاں دل ہی اداس ہو کوئی ساتھی نہ ہو تو ساون بھی مزہ نہیں دیتا۔ایک بھٹکے ہوئے راہی کو ہمیشہ کارواں کی تلاش رہتی ہے۔لیکن اب تو اپنے آپ سے ہی گفتگو کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔

دل کو دل ہی سہارا دے سکتا ہے۔

سمندر کو سمندر میں سہارا کون دے سکتا ہے؟

سمندر کی لہریں بھی سہارا مانگتی ہیں مگر ان کو سہارا نہیں ملتا اور پھر بھی یہ روتی واپس چلی جاتی ہیں۔ان کو سمندر میں سکون نہیں ملتا تو پھر زمین پر واپس آ جاتی ہیں اور ان لمحوں میں خاموشی کا طوفان دیکھ کر واپس سمندر میں چلی جاتی ہیں لیکن پھر

بھی زمین سے محبت کرتی ہیں مگر وہ بس جانے کا ان کو دکھ نہیں۔

لیکن میرے اندر کا دکھ بہت بڑا ہے۔ کون دیکھے گا کون سنے گا۔ کس کو سناؤں کون ہے میرا کوئی بھی تو نہیں ہے۔

جو مجھے ہمیشہ کہاں ہو تم آجاؤ مجھے تمہاری ضرورت ہے تم نے تو کہا تھا کہ ساون آتے ہی لوٹ آؤں گا دیکھو ساون آگیا ہے تم کیوں نہیں آئے......؟

آجاؤ میرے ہم نفس میرے ہم نشین میں ادھورا ہوں تم بن۔ کہیں یہ سانسوں کی مالا ٹوٹ نہ جائے ضبط کا دامن چھوٹ نہ جائے تمہیں قسم ہے آجاؤ۔ دیکھو میری آنکھیں کب سے تمہارا راستہ دیکھ رہی ہیں۔ بارش برس رہی ہے۔ باغوں میں جھولے پڑے ہیں۔ سب کچھ ہے یہاں۔ بس تم نہیں ہو جاناں۔ تمہیں اس برستی ہوئی بارش کی قسم میری قسم آجاؤ بس آجاؤ......!

وقاص عمر بلو ٹوگراف عجب گڑیا بگڑو......ضلع حافظ آباد

☆......☆......☆

تعلق توڑ دیتا ہوں مکمل توڑ دیتا ہوں
جسے میں چھوڑ دیتا ہوں مکمل چھوڑ دیتا ہوں
یقین رکھتا نہیں ہوں میں کسے کچے تعلق پر
جو دھاگہ ہو ٹوٹنے والا اسے میں توڑ دیتا ہوں
نفرت ہو کہ محبت وہ بکھرا رہتا ہوں شدت سے
کہ جدھر سے آئے یہ دنیا ادھر ہی موڑ دیتا ہوں
شاکر ابھی تک وہی بچپن وہی تخریب کاری ہے
قفس کو توڑ دیتا ہوں
پرندے چھوڑ دیتا ہوں۔

اسرار احمد میواتی......چھوکی

☆......☆......☆

غزل

عید کے دن بس ایک ہی حسرت دل میں ہوتی ہے
تیری دید کی خاطر میری آنکھ یہ روتی ہے
ہم نے اپنے خواب سنا کر ان کو مار دیا
آنکھ ہماری اشکوں سے کچھ خواب پروتی ہے
ہم کو تو کچھ پاس نہیں ہے پیار محبت کا
ایک اکیلی جان تو ہر دم آنسو روتی ہے
عید کا دن اس آس میں گزرا کب آئی ساتول
بے چینی بھی کتنی میرے دل کو ہوتی ہے
عید ہے یہ معلوم اگر ہو تو دید تقاضا ہے
حسرت تیری دید کی اب تو کم ہی سوتی ہے

معصوم ارشاد......سونگی

☆......☆......☆

گناہ نہ ہوتے ثواب ہوتے تو سوچو کتنے فساد ہوتے
سمندر سارے شراب ہوتے تو سوچو کتنے فساد ہوتے
کسی کے دل میں کیا چھپا ہے خدا ہی جانتا ہے
دل اگر بے نقاب ہوتے تو سوچو کتنے فساد ہوتے
ہم اچھے تھے مگر سدا ہی رہیں گے ان کی نظروں میں خراب
تھی خاموش فطرت ہماری جو اتنا عرصہ نبھا گئے
ہمارے ہر بھی جواب ہوتے تو سوچو کتنے فساد ہوتے

اسرار احمد میواتی......چھوکی

☆......☆......☆

آج پھر گرتے گرتے تھام لیا کسی نے
ساحل یہ لوگ مجھے مرنے کیوں نہیں دیتے

ممی ساتھ والے گھر میں میری بال چلی گئی ہے جا کرلے آؤں؟؟ موحد نے امید بھری نظر سے راشدہ بیگم کی طرف دیکھ کر کہا....
نہیں کوئی ضرورت نہیں ....صاف چٹا انکار آیا....موحد حیران سا کھڑا رہ گیا ۔بڑی بڑی آنکھیں کچھ اور پھیل گئی ...
لیکن کیوں ممی؟؟؟کیونکہ وہ صحیح عورت نہیں ہے.......آئی سمجھ؟؟؟
.دانہ لیا اور اسے پرندوں کے سامنے ڈالنے کیلئے چل دیں..
تو ممی میں تو اپنی گیند لینے جارہا ہوں اس سے ملنے تو نہیں نا!!!!!
معصومیت سے کہا گیا...
آپ سے کچھ بعید بھی نہیں موحد صاحب کیونکہ اگر آپ کے والد محترم اس بدچلن عورت سے ہمدردی میں دبلے ہوسکتے ہیں تو آپ بھی تو اس کے بیٹے ہو آپ میں بھی یہ مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوگا ہےنا...؟؟
راشدہ بیگم چباچباکر بولی جیسے الفاظ نہ ہوئے موحد کے والد محترم ہوں. چڑیوں کو دانہ ڈالتے ہاتھ فضا میں معلق ہوئے ...موحد حیران پریشان آنکھیں پھاڑے ممی کو دیکھ رہا تھا....آٹھ سالہ دماغ یہ سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر ان سے غلطی کہاں ہوئی ہے جو ممی سے اتنی تقریر سننے کو مل رہی ہے ......
ممی !!!
یہ بدچلن عورت کیا ہوتی ہے ...؟؟
اتنے سارے الفاظ میں یہ لفظ نیا لگا اور جھٹ سے پوچھ بیٹھا .. ہاتھ سے دانے والا برتن گرگیا فضا میں معلق ہاتھ مردہ ہوکر پہلو میں جھول گیا.....سانسیں سینے کی دیواروں سے سر پھوڑنے لگے راستہ ڈھونڈنے لگے......لیکن راستہ نہیں ملا راستہ کیسے ملتا آج کل لوگ سانسوں پہ بھی بندش لگانے میں ماہر ہوگئے ہیں .. چڑیاں . کوے .مینا.خاموشی سے اپنے محسن کو دیکھنے لگے اپنی زبان میں کچھ پوچھنے لگے....ان کی نین کٹورے لبالب پانیوں سے بھرے پھر چھلکے اور لمحوں میں کچی زمین پر گرکر انمول سے بےمول ہوگئے یہ وہ آنسو تھے جو پہلی بار زمین تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے ان کے آنسو اتنے بےمول نہ تھے ان کے آنسو کو کوئی اپنے ہاتھوں سے اپنےپوروں پر چنتا تھا آج وہ ساتھ نہیں تھا ... تووہ اکیلی تھی اور اکیلی عورت کیا ہوتی ہے کیسے ہوتی ہے یہ اسے چند دن میں رہ کر پتہ چلا ان چند دنوں میں اکیلے چلتے ہوئے پاؤں ابلہ پا ہوگئے..سر جھک گیا نظریں جھک گئی اور کیونکہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی اسے مجرم مانا گیا ..شرافت سے یہاں سے جاتےہو یا لگاوں ایک چپل ؟؟؟راشدہ نے یہ عقل مندی کی چھوٹے سے معصوم بچے کو یہ نہ سمجھانے بیٹھی کہ بدچلن کیا ہوتی ہے!!! اور موحد ممی کو فل فارم میں آتا دیکھ کر اگلے ہی لمحے گھر سے باہر تھا... کوئی آہنی پھندا اس کی گردن کو اپنے شکنجے میں جکڑ رہا تھا....یہ کیا ہورہا تھا... کیوں کر ہورہا تھا ....سانسیں کیوں رک گئی تھی؟؟؟
سزا کس جرم کے پاداش میں سنائی گئی ؟؟؟

وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پارہی تھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو ایک جملے نے چھین لی تھی ....
عرش سے فرش پر اتنے زور سے پٹخا گیا کہ روح تک بلبلہ اٹھی تھی ....اپنے انسو کو بےدردی سے مسلا اور کمرے میں اکر پھوٹ پھوٹ کر رودی .....
دشمن کے بارڈر پروہ دشمنوں سے جواں مردی سے لڑرہا تھا....لڑائی دشمنوں نے شروع کی اور مرد ہوکر وہ لڑرہے تھے.....
دشمن موت سے چھپتے لڑرہے تھے اور وہ موت کے آنکھوں میں آ نکھیں ڈالے آگے بڑرہے تھے.....
وہ آگے آرہے تھے ....زخم کھارہے تھے ...
لہو میں نہارہے تھے....لیکن اس حالت میں بھی دشمنوں کے چھکے چھڑا رہے تھے... وہ.گھبرا رہے تھے ....غلطی کررہے تھے اور ٹوٹ ٹوٹ کر جہنم واصل ہورہے تھے....نعرہ تکبیر بلند ہورہی تھی ....اور دلوں پر عجب بےخودی جسم پر عجیب سی سرشاری اور سنسنی پھیلارہی تھی.....کیا سے کیا ہونگے ہم کہاں سے کہاں جائنگے ہم ....اس امید اس آس نے اسے نڈر بنالیا ....بےپروا بنالیا اور اخر میں کامیابی نے ان سب کے قدم چھومے ...دشمن خاموش ہوچکے تھے ...انہیں خاموش ہی ہونا تھا ....وہ پاک کے جان بازوں کا مقابلہ نہیں کرسکے .... ان میں سر پر کفن باندھنے والوں کو ہرانے میں حوصلہ کہاں ہے....وہ حوصلہ کر بھی نہیں سکتے ..

ان میں ایک مسلمان ماں کے کوکھ سے جنم پانے والے مسلمان سپاہی کا سامنا کرنے کی ہمت کہاں ہیں ....وہ ہمت کربھی نہیں سکتے ....
نہیں ابراھیم آپ کو جانا ہوگا آپ کو جانا ہی ہوگا.. یہ میرے ملک کا سوال ہے یہ اس ملک کے ابرو کا سوال ہے ہم نے پیچھے ہٹنے کیلئے نہیں آگے بڑھنے کیلئے اس ملک کیلئے قربانی دی ہے ہمیں آگے بڑھنا ہے اسے دشمنوں کے ناپاک اعزائم سے بچانا ہے .... اس ...بات.. کی فکر مت کرو
”مم میں اکیلی ہوں “
”تت تو کیا ہوا آپ کی یادیں ہونگی نا میرے ساتھ“
اور خدا ہے میرے ساتھ آپ فکر مت کرئیے مجھے کچھ....نہیں ہوگا ..مجھے جملے بےربط سے منہ سے نکل رہے تھے کوئی چیز بار بار گلے میں اٹک رہی تھی ....آنکھیں دھندلا رہی تھی . ..وہ نظریں چرائے کہہ رہی تھی...یہ آنسو بھی کبھی کبھی کیسی مصیبت بن جاتے ہیں ....
نہ انھیں بہا سکتے ہیں نہ پی سکتے ہیں ...بہائیں تو بھی مصیبت..... پینا چاہئیں تو گلے کا ناسور بن جاتے ہیں...
ار یو شیور تم رہ لوگی ...؟؟؟؟
اس کو نظریں چراتے ہوئے دیکھ لیا تو آنکھ کی نمی کہاں چھپی رہی ...
ہاں آپ فکر مت کرو ...یہ آنسو بھی نہ اس نے جلدی سے رخ موڑا ...
دل تھا کہ درد سے پھٹا جارہا تھا آنسو تھے کہ بغاوت پر اترئے ہوئے تھے......
لیکن میں کیسے جاؤں تمہیں یوں اکیلا چھوڑ کرابراھیم بولا ... .اس نے ایک نظر اسے دیکھا اور درد نے پھر نئے سرے سے انگڑائی لی
اس شخص کو اپنے سے دور جاتے دیکھنے کی طاقت کہاں تھی اس میں ... اس کے چوڑے پیشانی پر تفکر کی گہری جال بچھی تھی....لب بھینچے ہوئے تھے...اپنے درد کو دباکر اور بمشکل تھوک نگل کر کہا کہ آپ فکر مت کرو ابراھیم میں رہ لونگی اخر اتنے سارے سپاہیوں کی بیویاں بھی تو اکیلے رہتی ہیں
میں بھی رہ لونگی کسی نہ کسی طرح آپ یہ سوچ کر پریشان مت ہوں بس جانے کی تیاری کریں ...رندھے ہوئے لہجے میں بولی...
باقی سب کی بات اور ہے ..آپ کی بات اور ہے ...اس نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا...
بلکل صحیح فرمایا ..کیونکہ میں ابراھیم صمید کی بیوی ہوں اور ابراھیم صمید کوئی عام نہیں بہت خاص ہیں سب سے خاص ...
اس سے پہلے کہ ابراھیم اس کی تعریفوں میں رطب اللسان ہوتا ..اس نے جلدی سے رخ اس کی جانب موڑ دیا...ابراھیم کے چہرے پہ پھیکی سی مسکراہٹ چھاگئی.اس سے دور جانا کتنا کھٹن تھا کتنے درد اٹھے .لیکن وہ چلا گیا ابراھیم سب سے کھٹن سب سے مشکل مہم پر روانہ ہوا ...وہ نہیں جانا چاہ رہا تھا اس کے قدم جیسے بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے....لیکن اسے جانا پڑا اسے جانا ہی تھا...
کیونکہ تحریم کا حکم تھا....اور تحریم کے حکم کی منافی ابراھیم کیلئے دنیا کا مشکل ترین کام ....وہ کچھ بھی کرسکتا تھا کچھ بھی ......لیکن تحریم کا حکم ماننا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا......

اور وہ اپنے فرائض بخوبی نبھاتا تھا.........

------ -------- -----

باقی سارے رشتہ دار مرگئے جو آپ منہ اٹھائے اسے ادھر لےکر ارہے ہیں !!!!پتہ نہیں جی .ہم تو اس معصوم کو اکیلا دیکھ کر اسے یہاں لےائیے چھوٹا ہے ابھی بہت رو رہا تھا.ماں باپ دونوں ہی نہ رہے بیچارے کے کیسے اکیلے رہتا؟!!.وہ ادمی سر جھکائے آہستہ سے بولا.... اپنے گھر لےکر جاتے اگر اتنی ہمدردی ہورہی تھی...ظاہرہ بیگم بری طرح تلملہ رہی تھی.

.بیگم ایک منٹ کیلئے چپ رہینگی آپ؟؟

نادر حسین دانت پر دانت جماکر بولے....

آپ کا بہت شکریہ بھائی صاحب .میں آج لےکر آنے والا تھا اس نے چھوٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر نادر حسین نے کہا

ظاہرہ نے چونک کر اسے دیکھا...اس نے اشارے سے چپ رہنے کا اشارہ کیا......

آپ کیا باولے ہوگئے ہیں کیوں رہنے دیا اسے ...؟؟؟

باقی بہن بھائی کہاں ہیں ..جو آپ یہ مصیبت سر مول رہے ہیں؟؟

اس ادمی کے جاتے ہی ظاہرہ بیگم نادر حسین پر چڑھ دوڑی ؟؟؟

ان کی بھی بیویاں ہیں...نادر حسین آرام سے بولا.....آپ اسے نوکر سمجھ کر رکھ لیں گھر کے چھوٹے موٹے کام کروالینا اس سے ...

نادر حسین مزید بولا....اٹھ سالہ بچی نے حیرت سے اپنے باپ کی طرف دیکھا.... اور نوسالہ چھوٹاوہ اتنا بھی چھوٹا نہیں تھا کہ اپنے ذات کے حوالے سے باتیں نہ سمجھتا ہو . ماں باپ کے ایکسیڈنٹ میں موت کے بعد اب دوسرا دھچکا تھا .سر جھکائے کھڑا تھا..نوکر بنانے کی بات سن کر اس نے متعجب ہوکر ماموں کو دیکھا....نوکروں کو تو مارا جاتا ہے ...کھانا نہیں دیا جاتا..کام خراب ہونے پر سزابھی دی جاتی ہے ....چھوٹا سوچ رہا تھا اور خوف سے لرزنے لگا .....

کام تو کرواونگی مفت کی روٹی تھوڑی کھلاونگی اس نے سفاکیت کی انتہا کرتے ہوئے کہا ... نادر حسین نے کندھے اچکا دئیے ...

مطلب صاف تھا اس نے بیوی کو کھلی چھوٹ دے دی تھی .اوے کا اوا ہی بگڑا ہوا تھا.. ....

جاو جاکر برتن دھو یہاں کھڑے کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو ظاہرہ بیگم نے حکم دیا....اس کی ٹانگیں کانپنے لگی ...

یتیمی...معصومیت...گھر سے دور ....دوسری جگہ پہلا دن اور پہلے دن کی خوفناک بلکہ دہشت ناک صورت نے اس کا خون نچوڑ لیا ....

اللہ سبب پیدا فرماتا ہے کبھی نہ کبھی کیسی چیز میں ایسے اسباب پیدا فرما دیتا ہے کہ بندہ حیران رہ جاتا ہے ....

اس کے ساتھ بھی یہی ہوا ماں تیل چھڑک کر اگ لگا دیتی تھی اور بیٹی اسے جلنے سے بچانے کیلئے اپنا تن من دھن وار دیتی . تھی ..

ہر جگہ ..ہر موقع پر...ہر دن ہر لمحہ وہ اس کے ساتھ تھی ...

ماں کو پتہ بھی نہ چلتا اور اس کے نوکر کے بجائے اس کی اٹھ سالہ بیٹی کام کرنے لگی..تھی---وہ خوش رہنے لگا تھا یہ گھر ا چھا لگنے لگا ... ڈانٹ ڈپٹ بھی بری نہ لگتی کہ اسے پتہ تھا مرہم ساتھ میں ہے ---جو لمحوں میں تکلیف رفع کردیتی ہے چھوٹی تھی لیکن محبت سے لبریز وادی تھی---اور کچھ ہی عرصہ میں چھوٹا بھول بھی گیا کہ وہ یتیم ہے پرائے گھر میں ہے اور پرائے گھر میں اس کی حیثیت ایک نوکر سے زیادہ نہیں ہے---- ...

حالات پرلگا کر اڑے تو اپنے ساتھ ظاہرہ بیگم کا طنطنہ اس کی جوانی بھی لےاڑے نادر حسین کام سے واپسی پر ایک ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا دو ماہ بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر وفات پا گیا لیکن وفات سے پہلے اپنے بھانجے سے معافی مانگنا نہ بھولا ....

چھوٹا بڑا ہوچکا تھا دسویں پاس لمبا چھوڑا خوبرو ابراھیم عرف چھوٹا اب چھوٹا نہ رہا.. مجھے معاف کردو ابراھیم .میں نے تیرے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے بہت ظلم ہونے دیا ...ہوسکے تو مجھے معاف کردینا اگر چہ میں معافی کے لائق نہیں .. .کانپتے لب معافی کے درخوست گار تھے.. ..یہ اپنے غلطیوں کا حساس تب ہی کیوں ہوتا ہے جب زندگی اندھیرا ہونے لگتی ہے!!!!!جب سحر کی امید دم توڑ جاتی ہے....جب دوسروں کی زندگی کے قیمتی ماہ و سال ان کے ناکردہ گناہ کے نظر ہوجاتے ہیں. مجھے شرمندہ مت کریں ماموں ....میں کبھی آپ سے ناراض تھا ہی نہیں تو معافی کیسی آپ نے تو مجھے زندگی کی وہ خوشی دی ہے....وہ قیمتی متاع دی ہے....جسکا احسان میں شاید کبھی نہ چکاسکوں ...جب نادر حسین کو ادراک ہوا کہ اب شاید وہ زیادہ دن نہیں جی سکے تو اس نے اپنی اکلوتی خوبصورت باحیا بیٹی کا ہاتھ ابراھیم کے ہاتھ میں دے دیا اور ابراھیم کو اور کیا چاہئے تھا ناراض ویسے بھی نہیں تھا مگر اس نے جو یہ خوشی دی تو اسکا دل چاہا ماموں کے ہاتھ منہ چھوم لے ....ظاہرہ بیگم نے واویلہ مچایا لیکن آج نادرحسین نے بیوی کی بھی پرواہ نہیں کی اور دونوں کا نکاح پڑھادیا......

ابراھیم دسویں کے بود مزید نہیں پڑھ سکا کیونکہ ظاہرہ بیگم نے اجازت ہی نہیں دی حلانکہ اپنی پڑھائی کا سارا خرچہ وہ خود اٹھاتا تھا. ..لیکن ظاہرہ بیگم نہیں چاہتی تھی ...کہ ابراھیم ان کے نکمے نالائق بیٹوں سے زیادہ پڑھے ان سے آگے نکلے....اور اس طرح ابراھیم ایک لائق فائق لڑکا صرف دسویں تک پڑھ کر بیٹھ گیا......

لیکن تحریم نے اسے فارغ نہیں بیٹھنے دیا اور پھر بہت جلد وہ پاک ارمی میں بطور سپاہی برتی ہوگیا......تحریم کے دو بڑے بھائیوں کی شادیاں ہوگئی اور تب ابراھیم کوالگ گھرلینے کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ وہ گھر اب گھر کم اور مچھلی بازار زیادہ معلوم ہورہا تھا....

تحریم کے چاروں بھائی ایک سے بڑھ کر ایک اوارہ اور کام چور واقع ہوئے تھے...ابراھیم کی تنخواہ اتنی نہ تھی کہ پورے گھر کا خرچہ پورا ہوتا..نادر حسین منوں مٹی تلے جاسوئے تھے گھر جو ان کی تنخواہ سے چلتا تھا اب ابراھیم کے پیسوں سے چلنے لگا .... ایک دن تحریم نے ڈھکے چھپے لفظوں میں بھائیوں سے یہ کہنے کی کوشش کی تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئے...تم ثابت کیا کرنا چاہتی ہوکہ ہم تمہارے نام نہاد شوہر کا کھا رہے ہیں جمعہ جمعہ اٹھ دن ہوئے ہیں نوکری پر لگے اور تم نے آنکھیں ہی بدل دی...بڑا بھائی غصے سے سرخ ہوکر بولا....پھر ظاہرہ بیگم کی طرف مڑا امی دونوں کو کل کے کل یہاں سے فارغ کرو اور ہاں کل کے بعد یہ اس گھر میں نظر نہ آئیں ....

غصے سے چباچباکر کہا گیا تھا... تحریم اس کی بیٹی تھی اکلوتی بیٹی اس نے بہت کوشش کی کہ بیٹے کا فیصلہ بدل جائے وہ بیٹی سے دور نہیں رہ سکتی تھی مگر وہ فیصلہ نہ بدلا....

اور دونوں ہمیشہ کیلئے اس گھر سے نکل گئے ......

سارا دن بھاگ دوڑ کرکے رات تک ایک دو کمروں کا کشادہ صحن والا گھر مل گیا...جو عارف ابراھیم کے استاد کی مرہون منت تھی ....گھر عارف کے بلکل ساتھ تھا بیچ میں ایک دیوار حائل تھی....جس کے بنا پر ابراھیم کو پسند آئی...اور اسی رات ابراھیم کو فوری باڈر پر حاضری کے آرڈر ملے ....دشمن فوج نے حملہ کیا تھا....

اور اسے حملے کا منہ توڑ جواب دینا تھا...ابراھیم گومگو کی کیفیت میں تھا....ایک دن کی دلہن کو یوں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا...لیکن تحریم نے اس کی تسلی کرادی اور وہ رات دو بجے گھر سے روانہ ہوا....صبح عارف وہاں گیا تو پتہ چلا کہ ابراھیم تو رات کو ہی ڈیوٹی پر چلاگیا ہے....

اسے اس کم عمر لڑکی پر بےتحاشہ ترس آیا اور بےساختہ ہی اس نے اس کے سر پر دست شفقت پھیر دیا........نئے پڑوسن کے گھر آتی راشدہ بیگم نے جو اپنے شوہر کو تحریم کے سر پر ہاتھ رکھتے دیکھا تو وہ وہ سمجھی جو غلط تھا جو اس کی اپنی سوچ کی پیداوار تھا...شیطان کی دیکھائی گی تصویر تھی ..شیطان کی لگائی اگ تھی جو آن کی آن میں ....اس کے تن بدن میں لگ گئی... ایک کم عمر خوبصورت دوشیزہ کا نام ان واحد میں بدچلن مشہور کرادیا...اور پھر نہ عارف کی ڈانٹ اثر کرسکی اور نہ محلے کی بوڑھی عورت مہاجرہ کی وہ تعریف جو وہ ایک دن یوں ہی بدچلن مشہور ہونے والی لڑکی کے گھر گئی .....تحریم ابھی ابھی عصر کی نماز سے فارغ ہوئی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی ..

اسکا دل بےساختہ دھڑک اٹھا....امید نہ تھی پر دل کبھی کبھی خوش فہمی پال لیتے ہیں ...یا پھر یوں ہی بات بات پہ دھڑکنا اس کی عادت ہوگئی ہے وہ

سوچنے لگی پھرسر جھٹک کر جیسے اپنے سوچوں سے راہ فرار اختیار کی ....دروازہ کھولا تو سامنے اماں مہاجرہ کھڑی تھی ...اسے خوشگوار حیرت ہوئی یہ پہلی عورت تھی ۔جو اس کے دروازے تک آئی تھی --- جلدی سے سلا م کیا ..کمرے میں بیٹھایا اور منٹوں میں ان کیلئے شربت بناکر لے آئی.وہ بہت خوش تھی شاید بدگمانی کے بادل چھٹ جائیں ---وہ سوچنے لگی---- اماں مہاجرہ تحریم کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی یہ وہ تو ہرگز نہیں تھی جو مشہور کردی گئی تھی....اس نے ایک نظر نماز کی حالت میں بندھے اس کے دوپٹے کو دیکھا اور پھر اس کے دھلے دھلائے چہرے کی طرف .....اور دل میں دکھ کی ایک لہر اٹھ گئی ......بیٹھو نا میری بچی اماں مہاجرہ نے پیار اور شفقت سے پرلہجے میں کہا ...اور وہ خوش ہوگئی میری بچی سن کر اس کا سیروں خون بڑھا.... آپ کے شوہر کہاں ہیں بیٹی ؟؟؟اس کی آنکھیں بےساختہ ہی نم ہوئی وہ وہ سپاہی ہیں پاک انڈیا کے سرحدی بارڈر پر تعاینات ہیں....وہ دھیمی سی آواز میں بولی .....اماں مہاجرہ مزید دکھی ہوئی کیونکہ محلے میں تو کچھ اور ہی مشہور تھا....جب اماں مہاجرہ وہاں سے نکلی تو اس کے دل میں تحریم کیلئے محبت اور احترام بھر چکا تھا اور اگلے دن پورا محلہ تحریم کے گھر جمع تھا ..اور راشدہ بیگم انگاروں پر لوٹ رہی تھی ...عارف کی ہمدردی بھی تحریم کے ساتھ کم ہونے کے بجائے بڑھ رہی تھی اور اب رہی سہی کسر محلے والوں نے پوری کردی ......اور ایک ملاقات میں ہی وہ سب تحریم کے گرویدہ ہوگئے تھے...

سب نے اس سے معافی مانگی اور تحریم نے خوش دلی سے سب کو معاف کیا حلانکہ مشکل تھا...اپنی ذات پر کیچڑ اچھالنے والوں کو معاف کرنا لیکن ظرف بڑا ہو تو کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا .... تم اتنی گر جاوگی راشدہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا ...وہ میری بیٹی کی جگہ ہے اور آپ نے آپ نے کیا کچھ مشہور کردیا اس بیچاری کے بارے میں.... مجھے افسوس اور دکھ کے ساتھ ساتھ شرم آتی ہے تیری سوچ پر........وہ ایک سپاہی کی بیوی ہے ایسے سپاہی کی جو ایک دن کی دلہن کو اکیلا چھوڑکر ڈیوٹی نبھانے چلاگیا ...کس لئے ہمارے لئے اس ملک کیلئے اس دھرتی کی حفاظت کیلئے اور اس کی نوعمر بیوی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہاں سے زندہ لوٹ آنا اتنا اسان نہیں...ہر دن ہر لمحہ موت سے کھیلنا پڑتا ہے ...پھر بھی اس نے قربانی دی اپنے شوہر کو ملک کی حفاظت کیلئے بھیج دیا اپنے آپ کو دنیا کے ظالم تھپیڑوں کے سپرد کیا اور آپ اس کے فیصلے کو غلط کرنے پر تلی ہیں آپ جانے انجانے میں اپنے ملک سے زیادتی کررہی ہیں .. ...کل کو کوئی تحریم اپنے آپ کو اکیلا نہیں ہونے دی گی اپنے ملک کے بارے میں سوچنے سے پہلے اپنے بارے میں سوچے گی ...

کیونکہ کچھ بھی ہو...عزت بحرحال سب سے اہم ہے ..جو آپ نے اس معصوم لڑکی سے چھیننے کی کوشش کی ...

ایک استاد کی عزت کو داغدار کیا. اس سب کو کیا کہوں راشدہ !!!!!کیوں کررہی ہو یہ سب؟؟؟؟

تمہیں تو اس کا دھیان رکھنا چاہئے تھا اسے تسلی دینی چاہئے تھی حوصلہ بڑھانا چاہئے تھا ....اور آپ یہ سب کررہی ہیں .....مجھے شرم آتی ہے آپ کی سوچ پر اتنی سطحی سوچ ہے آپ کی عارف دکھ سے لبریز آواز میں کہہ رہا تھا.....

اور راشدہ اپنے آپ کو پاتال کی اتہا گہرائیوں میں گرتا محسوس کررہی تھی... اس پر اضطرابی کیفیت چھاگی ....بےساختہ ہاتھوں کو مسلنے لگی .....بےقرار ہونے لگی یہ کیا ہوا مجھ سے؟؟؟

کیسے ہوا ؟؟؟

وہ اب پیشانی مسلنے لگی ....بےقراری بڑھ رہی تھی ....احساس جرم کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا تھا...چند لمحے بس چند لمحے لگے اس کے دماغ سے دل سے غلط فہمی کے پردے سرکنے میں اور اس کی جگہ احساس جرم اور شرمندہ گی نے لی.....عارف غور سے بیوی کی حرکات ملاخط کررہے تھے ....معافی مانگنے چلئیں ؟؟

عارف نے اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے پوچھا...

نہیں ایسے نہیں پہلے پورے محلے والوں کو اکھٹا ہونے کی خبر دیتی ہوں ....کیوں عارف حیرت سے بولا...پورے محلے میں اس کو بری مشہور کیا تھا بدچلن مشہور کیا تھا اب معافی بھی پورے محلے کے سامنے مانگونگی اس نے کہا اور عارف بےساختہ پرسکون ہوا .....اور پھر محلے کے ساتھ ملکر وہ تحریم کے گھر گی اور سب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگی ...اس کے قدموں میں بیٹھی تحریم نے تڑپ کر اسے پاوں سے اٹھاکر سینے سے لگا لیا ......

تحریم خوش تھی بےانتہا خوش کیونکہ اس کی کردار پر اٹھی انگلی خود ہی نیچے ہوچکی تھی ....اسے کے ماتھے پر بدچلن کا داغ لگانے والی نے یہ داغ خود مٹادیا.....

دشمنوں کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کا سہرا ابراھیم کے سر سجایا گیا...اس کے تیز ذہن نے ایسا منصوبہ بنایا کہ دشمن ہل بھی نہ سکے....اور ابراھیم کو انعام کے ساتھ ساتھ پروموٹ بھی کردیا گیا اسے ترقی ملی ....

گھر ملا.......وہ بےانتہا خوش تھا..اور ایک پیچھلے پندرہ دنوں میں پہلی بار تحریم کو کال ملارہا تھا...کیسی ہوگی کتنا یاد کرتی ہوگی اور کتنی خوش ہوگی میری ترقی اور دشمنوں کی ہار کی بات سن کر...

وہ کانپتے ہاتھوں سے نمبر ملا رہا تھا.. اور مختلف سوچیئں دماغ پر حملہ آور ہورہی تھی....

شام ہونے والی تھی ....سورج اپنی بچی کھچی کرنئیں سمیٹنے میں لگا تھا....دن بھر کے تھکے ہارے پرندے آپنے آپنے آشیانوں کی طرف محوپرواز تھے.......وہ موبائل ہاتھ میں پکڑے حسرت سے اسے تک رہی تھی...اس کی آواز سننے کو کان ترس گئے تھے.....کیسا ہوگا؟؟؟!کیس حال میں ہوگا.....اچانک موبائل پررنگ ٹون ہوئی موبائل اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا....سکرین پر نظر پڑی تو دل نے اچھل کود شروع کردی ....ابراھیم نام بلینگ ہورہا تھا.....

اس نے سیکنڈ کے دوسرے حصے میں کال اٹینڈ کی ...سلام دعا کے بعد ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی اور پھر دونوں طرف خامشی چھا گئی....تحریم!!!!!!! دل کے نہاخانوں میں طلاطم برپاکرنے والا لہجہ .....

جی تحریم کے لب مسکائے ...

ایک خوش خبری دوں ؟؟؟

ہاں جلدی دو نا پلزز وہ فورا بےحد ایکسائٹڈ ہوئی..بائے دی وے یہ خوش خبری دینا تو عموما عورتوں کا کام نہیں؟؟؟؟

معنی خیز شرارت سے پوچھا گیا.. تحریم بلش کرگئی ...ابراھیم تنگ نہ کرو بتا بھی دواب ...وہ بسوری ...مجھے پروموشن مل گئی ہے ..انعام بھی ملا ہے اور اور گھر بھی آواز خوشی سےبھرا گئی.....

سچی!!!!!!!خوشی سے اچھلی پھر چیخی ..مچی ..

اور !!!!!وہ اٹکنے لگی

اور کیا ابراھیم نے دلچسپی سے پوچھا .. اور آپ کب آئنگے ...کہہ کر لمبی سانس بھری بڑا معرکہ سر کیا تھا آخر...آبھی آوں؟؟؟؟

ابراھیم شوخی سے بولا ..نن نہیں تحریم گھبرا کر بولی اور ابراھیم کے منہ سے بےساختہ قہقہہ نکل گیا...ان شاءاللہ دو دن بعد اسے تنگ کرنا موقوف کرکے کہا.....تھوڑی دیر بعد ابراھیم نے فون بند کیا اور تحریم کے انگ انگ سے سرشاری پھوٹنے لگی .....ایک نظر پھیلتے اندھیرے پر ڈالی آج اندھیرے سے ڈر نہیں لگا .....کیونکہ اب ان کی زندگی میں سحر ہونے والی تھی ... وہ اٹھی اور شکرانے کے نوافل ادا کرنے چل دی.....

راحیلہ بنت مہر علی شاہ گاوں آماخیل ضلع ٹانک

"پھول جب مرجھائے..."
بقلم..
بنت عبدالخالق ملتان

"آفت کے پرکالے... مر ہی کیوں نہیں جاتے..." دانیہ نے مکمل غصے میں، کانپتی زبان کے ساتھ... گول مٹول عکاشہ کو بددعا دی...
"ارے بہو... کتنی مرتبہ کہا ہے کہ سوچے سمجھے بنا ، بات منہ سے مت نکالی کر...." بوڑھی ساس نے تسبیح کے دانے گراتے ہوئے کہا...
پاس پڑے گلاس سے پانی کا گھونٹ بھرا اور گویا ہوئیں...
"قبولیت کا وقت بھی ہوتا ہے..."
بوڑھی ساس کا ابھی اتنا کہنا تھا کہ بہو صاحبہ اپنے کندھے پر جھولتے بالوں کو جھٹکا دے کر ساس کی طرف رخ بدل چکی تھی....
"آپ کو تو بس باتیں کرنا اور باتیں بنانا آتا ہے... بچے سنبھالنا پڑیں تو پتہ چلے....؟؟" دانیہ کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا....
"دانی... بری بات...." اتنے میں اسلم کہیں سے آ ٹپکے....
اسلم نے بس اتنا کہنے پہ اکتفا کیا تھا ، کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ اگر اس نے کچھ زیادہ کہہ دیا تو بم ، گولے کا رخ ، اس کی طرف ہو جائے گا....
"یہ بچے اتنا ذلیل کرتے ہیں ، آپ کو تو ذرا احساس بھی نہیں... تپ کر ہی مرنے کی بددعا دیتی ہوں..." دانیہ نے خود کو مظلوم ثابت کرنا چاہا...

"دانی ... میں قربانی کے لیے جا رہا ہوں... دانیال کو اٹھا لو...." اسلم نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا...
"دانیال کو دے دیجیے مگر عکاشہ کو اپنے ساتھ لے جائیں...." دانیہ نے دو سالہ دانیال کو اٹھانے کے لیے ہاتھ پھیلائے...
"عکاشہ کو...." اسلم نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا...
"ہاں ... عکاشہ کو ہی..." دانیہ نے ایسے جواب دیا ، جیسے اس نے اسلم کی حیرانی کو محسوس نہ کیا ہو...
"ابھی عکاشہ چھوٹا ہے... وہاں خون وغیرہ ہوگا تو عکاشہ....؟؟ " اسلم ساڑھے چھ سالہ عکاشہ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ دانیہ نے بات کاٹی...
"یہ سب نہ لے جانے کے بہانے ہیں..." دانیہ نے جل کر کہا ....
"نہیں ہرگز نہیں... یہ چھوٹا ہے ، اگر کوئی اول فول حرکت کردی تو....؟؟" اسلم نے پریشان ہوتے ہوئے کہا...
"بہو .... قربان گاہ میرے شہزادے کو نہ بھیجو... کہیں ڈر نہ جائے..."
ساس صاحبہ نے نہایت نرم اور پیار بھرے لہجے میں کہا...
مگر دانیہ نے اپنی ساس کی بات کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا...
حالانکہ وہ کسی بات کو نظر انداز کرنے والی نہ تھی.... شاید کہ وہ آج ، عید کے دن ، ساس سے بحث نہیں کرنا چاہتی تھی...
"یہ گدھا بہت تنگ کرتا ہے ... مر کیوں نہیں جاتا..."
دانیہ نے نہایت خفتگی سے کوستے ہوئے کہا...
اسلم نے اسی میں ہی عافیت سمجھی کہ لیتا ہی چلوں.... ورنہ محترمہ بددعائیں ہی دیتی رہیں گی....
اسلم ماں جی کو سلام کر کے قربان گاہ چلا گیا....
عید کے دوسرے دن ساس صاحبہ نے دانیہ سے کہا کہ
"کافی ماہ گزر گئے ہیں، تم عابدہ بیگم کے گھر نہیں گئی... آج پہلی فرصت میں وہاں جانا..." دانیہ کی ساس جوڑوں کی درد کی مریضہ ، زیادہ چلنے سے عاجز تھی... بہو کو اپنے سہیلی کے گھر جانے اور خیر خبر لینے کا کہا... اور دوسرا یہ بھی کہ بہو کہ کوئی رشتہ دار نہیں ہیں... حتی کہ ماں ' باپ بھی حیات نہیں...
عید کا دن تو گھوم پھر کر ہی گزارہ جاتا ہے نا ... سو بہو کو آفر دی۔
بہو ٹھہری سدا کی گھوم پھرنے والی، فورا ہاں میں ہاں ملائی...
تقریبا بارہ بجے ساس سے پوچھا کہ
" اب چلی جاؤں..."
ساس نے بھی بات سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ
"اب مرد حضرات گھر نہیں ہوں گے کیونکہ اسلم اور وہ سب اکٹھے گھومنے پھرنے گئے ہیں لہذا تم ہو آؤ..."
اب جی بہو صاحبہ کی تیاریاں شروع ہوئی کہ ساڑھے چار سالہ ابیہا کی چیخ کی آواز آئی...
بہو ، جو کہ عکاشہ کو ٹپ میں نہلا رہی تھی، عکاشہ کو وہیں سے چھوڑ کر بھاگی....
وہاں جو منظر دیکھا ، آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...
دانیال نے ابیہا کی گردن پہ چھری چلا دی تھی....
دانیہ کو یاد آیا کہ نجانے اسلم نے کتنی مرتبہ ،مجھے چھڑیاں اندر رکھنے کا بولا تھا...
مگر میں ٹھہری سدا کی سست اور لا پرواہ....
جیسے ہی دانیال نے ماں کو آتے دیکھا ، سیڑھیوں کی طرف بھاگنا شروع کیا مگر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دھپ کی آواز کے ساتھ گرنے کی آواز آئی... اور
وہ ہوا ، جو نہیں ہونا چاہیے تھا...
چند لمحوں ہی میں ، دانیال زندگی کی بازی ہار گیا...
ساتھ ہی دانیہ نے بھی چھلانگ لگائی اور اپنا بایاں بازو اور ناک کی ہڈی تڑوا بیٹھی...

جیسے ہی دانیہ ، دانیال کے پیچھے نیچے گری تو دانیال اور خود کو بھول بیٹھی اور اب عکاشہ کی ٹینشن ہوئی مگر اس کے اوپر پہنچنے تک یکے بعد دیگرے اس کے تینوں پھول مرجھا چکے تھے...
اور بوڑھی ساس، دیوار کا سہارا لیتا ہوئے باہر صحن تک آ چکی تھی...
دانیہ نے قہر آلودہ نظروں سے ساس صاحبہ کو گھورا...
اب ہو بھی کیا سکتا تھا...؟؟
دل میں آیا کہ بس جلد از جلد عکاشہ کے بابا کو کال کروں...
بھاگتی ہوئی گئی... کمرے سے دروازے سے ٹکراؤ ہوا اور اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے گر گئی... جلدی میں اٹھ کر موبائل کی طرف لپکی...
ساس صاحبہ کو ابھی سانحہ کی خبر نہ تھی...
بہو کی بوکھلاہٹ دیکھ کر پوچھا
" بہو... کیا ہوا؟
اتنی پریشان کیوں ہو..؟؟
خیر تو ہے نا...؟"
مگر دانیہ نے نظر انداز کرتے ہوئے اسلم کو ڈائریکٹ کہا کہ
"تینوں پھول مرجھائے گئے ہیں، جلدی آؤ..."
جیسے ہی ساس نے یہ سنا ، بمشکل سے جلدی جلدی قدم اٹھاتی ، صحن کے دوسری طرف گئی... وہاں کا منظر ، دل ٹرپا دینے والا تھا...
دانیہ کی ساس کی دل کی دھڑکن نے زور پکڑا...
تھوڑی دیر میں، اسلم نہیں بلکہ اسلم کی خبر آئی... جو جلد گھر آنے کے چکر میں لقمۂ اجل بن گیا....
اسلم کی ماں نے جب ایک گھر میں چار لوگوں کی وفات کی خبر سنی تو دل کی دھڑکن نے مزید روز پکڑتے ہوئے، قابو نہ ہونے کی دھمکی دی...
جوان اور اکلوتے بیٹے کی موت...
اف...!!
جو ماں کی کل کائنات تھا...
جب چاروں کی میت ، صحن میں رکھ دی گئی تو ہر آنکھ اشک باز تھی مگر دو آنکھیں خشک تھیں، شک ہوں گزرا ... جیسے وہ دو آنکھیں بھی سونے کے قریب ہیں...
آخر وہ شک ، یقین میں بدلا اور جنازے اٹھنے سے قبل اسلم کی والدہ محترمہ نے اپنی جان، جان جاناں کے سپرد کر دی...
ویسے دانیہ کا میکہ تو سرے سے تھا ہی نہیں اور سسرال میں بھی بس دو افراد شامل تھے...
ایک ساس اور ایک نند ، جو کہ سعودی عرب رہتی تھی...
وہ سر توڑ کوشش کے باوجود ، اپنی والدہ محترمہ، بھائی اور پھولوں کے جنازے پہ نہ آ سکی....
ویسے بھی بھابھی کا رویہ، اکلوتی نند کے ساتھ اچھا بھی نہ تھا... سو سسرال بھی یوں ختم ہوا...
تین دن ساتھ والی آنٹی کی بہو اور دو اور عورتیں، دانیہ کو تسلی دینے کے لیے ، دانیہ کے پاس ٹھہری ...
مگر تیسری دن، وہ ساتھ بھی گیا۔
دانیہ سوچنے لگی کہ سچ کہتے ہیں کہ
"لوگ تسلیاں تو بہت دیتے ہیں مگر ساتھ نہیں..."
تیسرے دن ، رات کے وقت، اچانک دانیہ کی نظر آئینے پر پڑی... اس کے ماتھے پر لکھا "ظالم عورت" نظر آیا....
ماتھے پر لکھا ، ہاتھ سے مٹانے کی بہت کوشش کی مگر وہ جوں کا توں رہا... یہاں تک کہ ماتھے سے خون رسنے لگا...
اور گربان میں جھانکنا چاہا تو ساس صاحبہ کی ہزاروں نصیحتیں اور باتیں یاد آئیں...
"سوچ سمجھ کر بات کیا کرو، قبولیت کا وقت بھی ہوتا ہے..."
ہاں واقعی ، کبھی نہ کبھی بددعا قبول ہو ہی جاتی ہے--
اس لیے سوچ سمجھ کر ہی بولنا چاہیے...
کتنا قیمتی قول ہے نا کہ
"پہلے تولو، پھر بولو..."
مگر...!!
اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت..."
اس سانحے کے بعد، دانیہ کی عقل مندوں والی باتیں کرنا شروع کردی اور عقل مندی کا ثبوت دینے لگی۔
ہر کسی کو برائیوں سے بچاؤ کا طریقہ بتاتی خصوصا بددعا نہ دینے کی اپیل کرتی...
آخر کو دانیہ نے یہ تجربہ اپنا خاندان گنوا کے کیا تھا۔
پورا خاندان کھو بیٹھی تھی...
بقلم
بنت عبدالخالق ملتان

فاطمہ حیا خان ....افسانہ ......
---خاکزادی--

روز بہت سارا کھانا بچتا ہے
.. پھینکنےسے اچھاہےساتھ
والی بیوہ عورت کو دے آؤ .
بیچاری دعا دے گی یتیم
بچے بھوکے ہوں گے .اماں
نے جائے نماز اٹھاتے ہو ئے
تسبیح رکھی . بہت
پیارسے شانزے کو کہا پر اس
نے ڈرامہ دیکھتے ہوئے ماں
کی بات ان سنی کردی .یہ
روز کا معمول تھا کھا نے کے
بعد ٹی وی کے آگے بیٹھ
جاتی اور ڈرامے کے ختم ہونے
کے بعد وہ کچن سمیٹتی دن
کا سارا بچا کھانا .ڈسٹ بن
میں ڈال دیتی یہ سوچے بنا
کے آج الله کی مخلوق ان کے
پڑوس میں خود داری کی
زنجیر سے بندھی چپ چاپ
فاقوں سے لڑتے سوگئی
---بیش بہانعمتوں کے
ساتھ اختتام کو تھارمضان--
آج متوقع چاند رات تھی
-شانزے فرط مسرت سے آج
چھت پے آگئی تھی .چاند
دیکھنے .جب ہی بے
ساختہ اس کی نظر ساتھ
والےگھر میں اس بیوہ
،عورت پر پڑی جو ہاتھ بلند
کئے دعا میں مشغول تھی
اور آنکھوں سے آنسو رواں
تھے-بہت کو شش کے
باوجود بیوہ عورت کی آواز
نہ سن سکی ..حسب معمول
آج بھی امی نے کھانا دینے
کو کہا تو وہ خلاف معمول
کچن میں بچا سارا کھانا ٹرے
میں رکھ کے دینے چلی گئی
.اسلام وعلیکم -- کیسی ہیں
آپ ..کھانا ایک بوسیدہ سی
چارپائی پے رکھ کے وہ خود
بھی عورت کے برابر بیٹھ
گئی .
میں ٹھیک ہوں آپ.... آج
کیسے ہمارے ہاں آ نا ہوا-
اس سادہ سے چہرے پے ثبت
ملیح سی مسکراہٹ میں نا
جانے ایسا کیا تھا کے شانزے
خجل سی ہوگئی-کہ وہ
بچا ہوا کھانا لے کے آئی ہے

"جی میں وہ بس ...کھانا دینے
آئی تھی ..کھانے کے نام پے
دو بچے بھاگ کے ماں کے
پاس آئے تھے .زرد بلب کی

ملگجی سی روشنی میں ان
کی آنکھوں جگنو سے چمکے
تھے " امی نے ٹھیک
کہاتھا بچے واقعی بہت
بھوکے ہیں ..شانزے نے دل
میں سوچا .جزاک الله بہنا ..
الله آپکو اسکا اجر دے .آمین ..
بچے ابھی کھانا مانگ رہے
تھے اور آپ لے آئیں ۔آج
واقعی چاند رات ہے ....!

پر وقار چہرہ الو ہی سی
مسکرا ہٹ پے شکر کا کلمہ...
وہ بولتی رہی اور شانزے
حیران سی سنتی رہی اتنی
لا چا ری وغربت میں بھی
آسو د گی ...اس عورت کے
چہرے میں کتنے گہرے رنگ
تھے ..
"بس چاند نظرآجائےتوہم
فرینڈز منائیں گے آپ بھی
آنا خوب انجوائے کریں گے۔
شانزے نے خوش دلی سے
کہا .آسمان کو دیکھا جہاں
چاند کہیں نظر نہیں آیا .
.بہنا چاند رات تو چاند
زادیاں مناتی ہیں ہم خاک
زادیاں تو جس دن روٹی نظر
آجائے عید منا لیتی ہیں .
بظاہر مسکرا کر انہوں نے
اپنی زندگی کی تلخ حقیقت
بیان کی تھی ۔شانزے کو
ذرا وحشت سی ہونے لگی
زندگی کا یہ چہرہ پہلی بار
دیکھ رہی تھی .کچھ دیر با
ت کر کے وہ الجھے ذہن کے
ساتھ گھر کو لوٹ آئی
۔نہ جانے کتنے معصوم چاند
رات سے واقف بھی نہ
ہوں انکی بھوک ایسے
تہوا روں میں بھی نہ
مٹتی ہوں تو کیا چاند رات
کیا عید..! .

لوگ عید کے نام پے کتنے
خوش ہوتے ہیں ..یہ جانے بنا
کے کچرےکےڈھیر سے اپنا رزق
تلاش کرتے وہ معصوم چہرے
عید کا نام سن کے رو پڑتے
ہوں گے ....چاند رات کی
چمکتی شام میں ننھے گالوں
پے پھسلتے ان کے معصوم
خواب کی کرچیاں کوئی
نہیں دیکھ پا تا سوائے چاند
کے .....لوگ چاند رات کو
بادلوں میں چاند کو ڈھونڈ کے
اپنی عید کی فکر کرتے ہیں
اور چاند زمین کے ننھے چاند

کے آنسو دیکھ کے شرم سے
چھپ جاتا ہے کہ کوئی مجھے
دیکھ کے رو نہ لے .....چاند
انسان نہیں .جواپنی عید کی
خوشی میں کسی کے آنسو
نہ دیکھے

وہ ساری رات چاند رات
بھول کے اس عورت کی
صبروقناعت اور اپنی نا
شکری کو سوچتی رہی ایک
تن تنہا آزمائشو ں میں گھری
..دنیا کی بھیڑمیں اکیلے
سفر کیئے جا رہی تھی
ساتھ دو بچوں کی ذمہ
داری ...!
ٹی وی دیکھتے جانے وہ کب
سو ئی تھی۔چاند نظر نہیں
آیا تھا ایک اور روزہ ..!
امی چاند کیوں نظر نہیں آیا ...
پتا نہیں نظر نہیں آیا کمیٹی
والوں کو۔
اف آج تیسواں روزہ
----!میں اتنی detixe ...
تھی "
شانزے نے قدر ے جھنجھلاہٹ
سےکہا۔

بیٹاسب ہماری طرح آسودہ
حال نہیں ہوتے سب خوشی
خوشی چاند رات کےمنتظر
نہیں ہوتے .کچھ لوگوں کی
بےبسی کا مذاق اڑاتی ہیں
چاند رات کی خوشیاں .ان
سے کل کی عورت یاد آگئی
شانزے کو کچھ دیر ماں سے
اسی کے بارے میں بات
کرتی رہی .
ایک سال پہلے شوہر کی
وفات کے بعد بیوگی کا داغ
لگتےزندگی تن تنہا ہو
گئی ۔مشکل وقت میں
رشتہ دار وں کی طوطا
چشمی ..دو بچوں کی بھا ر
ی ذمہ داری اس کے نازک
کاندھوں پے آن پڑی تھی
ایک ہمدرد دوست نےہی سر
چھپانے کے لیئے یہ چھوٹا سا
مکان دیا ہے .کم کر ا یہ پے .وہ
بچوں کو ٹیوشن پڑھا کے یا
سلائی کڑھائی کر کے گزر
بسر کر رہی تھی .بچے
سرکاری اسکول میں زیر
تعلیم تھے .

آج کل شد ید گرمی کے باعث
بل بہت آ گیا تھا جب ہی
آج کل فا قوں کی نوبت آگئی

تھی ....شانزے کو یہ سب
جان کے بہت دکھ ہوا .وہ آ
ب دیدہ ہوگئی .
نہ جانے دنیا میں روز کتنے
لوگ کھانا کھا کے بچا ہوا
کھانا ضائع کرتے ہوں گے .
واقعی یہ سچ ہے کے کچرے
کے ڈھیرمیں پڑا کھانا اس بات
کا ثبوت ہے کہ انسان پیٹ
بھر نے کے بعد اپنی اوقات
بھول جاتا ہے .پتا نہیں کتنے
لوگ اس بے حسی کی وجہ
سے بھوکے سوتے ہوں
گے
.
بے حس لوگ .
شانزے نے تاسف سے سوچا ..
....!بلکل اندر سے آواز آئی
تھی .
..کون سےلوگ کیسے لوگ "
کسی نے گویا جنجھوڑ ھ کے
پوچھا تھا. لوگ تو ہم خود
ہی ہوتے ہیں نہ جانے ہم
کس کو لوگ کہہ کر خود کو
لوگوں کے خانے سے ہٹا دیتے
ہیں .

شانزے کو بار بار ڈسٹ بن
میں ڈالا ہوا کھانا اور ان
بچوں کے فاقوں سے نڈ ھال
چہرے نظر وں کے سامنے
چکرانے لگے بے حسی کے
بعد ایک احساس جاگا ان کے
لیئے اور اتنی شدت سے جاگا
کے رگ و پے میں سکون بن
کے سرا ئیت کر گیا .
لوگوں میں سب کچھ ہوتا ہے
بس احساس نہیں ہوتا ..ہو
بھی تو سویا رہتا ہے بس
جاگنے کی دیر ہوتی ہے .
شانزے میں بھی دیر سے
سہی احساس جاگ گیا تھا ..
اور احساس ہی انسانیت کی
معراج ہے .کہ دو سروں کا
ہمدرد نہیں درد شناس بنا

""سنو !کہاں جا رہی ہو .وہ
دیکھو چاند نظر آگیا ."
امی نے پیچھے سے آواز دی ..
بلایا مگر وہ نہیں گئی .
شانزے نے مسکرا کے آسمان
پے چمکتےچاندکو
دیکھا.واقعی کل عید تھی ..
پر چاند زادیوں کی ..کیوں کے
انکا چاند نظر آگیا تھا .
پرخاک زادی کاچاندتو نظر
نہیں آیا تھا نا ..وہ کیسے
عید کریں ؟انکو انکا چاند

بھی تو دکھانا تھا ...
شانزےنے مسکرا کر سوچا اور
کھانے کی بھری ٹرے لئے
گھرسے نکل گئی

....

عمل پر یقین رکھو بیٹا
تحریر : عنایہ فاطمہ
میری سماعتوں سے دادا جان
کی آواز ٹکرائی۔ میں جو رٹو
طوطے کی طرح "اسلامیات" کا
سبق یاد کررہا تھا چونکا۔
نماز اول وقت میں پڑھنا"
افضل ہے" "جی داداجان"۔ میں
داداجان" کی انگلی پکڑے"
مسجد کی طرف رواں دواں
سال کا8تھا۔ اس وقت میں
تھا۔
امی جان بہت بھوک لگی
"ہے کیا بنا ہے آج "لوکی گوشت
جواب باجی کی طرف سے آیا۔
کیا!!! آپ کو پتا ہے مجھے لوکی
اچھے نہیں لگتی۔ پھر
بھی آپ نے لوکی بنائی۔
میں غصے میں بولا۔ "عون
محمد کتنے دکھ کی بات ہے
لوکی گوشت کھانے سے
انکار کر رہے ہیں حالانکہ آپ
کو پتاہے کہ "لوکی" ہمارے
(صلی اللہ علیہ وسلم)نبی
کو کتنی مرغوب تھی۔
سعادت سمجھ کہ کھایا کرو"
بچے" داداجان نے نصیحت
کی۔ میرا سر شرم سے جھک
گیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن
میں نے شکم سیر ہو کر
9 کھانا کھایا۔ اس وقت میں
سال کا تھا۔
میں دادا جان کے ساتھ
سیلاب زدگان کی بستی
میں امداد کے سلسلے میں آیا
تھا۔دادا جان متاثرین میں
سامان تقسیم کر رہے
تھے۔میں تھوڑا دور کھڑا
یہ منظر دیکھ رہا تھا۔
متاثرین کے بچے متلاشی
نظروں سے میری "ریموٹ
گاڑی" کو دیکھ رہے تھے۔
ایک بچہ اپنی ماں کی گود
میں مسلسل روئے جارہا
تھااور باربار میری گاڑی کی

طرف اشارہ کر کے کوئی
مطالبہ کر رہا تھا۔ دادا جان
میری طرف بڑھے۔ میں نے
اپنی گاڑی کو سینے سے
لگایا۔ "عون محمد یہ گاڑی
اس بچے کو دے دو' '۔
داداجان نرم آواز میں بولے۔
لیکن یہ میری ہے"۔میری آواز"
گلے میں ہی اٹک گئی۔"عمل
پر یقین رکھو بیٹا،دوسروں
کو دینے کا جذبہ لاو ٔ میرے
بچے"۔ انھوں نے شفقت
سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔
میں اپنی جگہ ہٹا اور ریموٹ
گاڑی اس بچے کے حوالے کر
دی۔ بچہ گاڑی لے کہ
بہت خوش نظر آرہا تھا۔
اس کی والدہ دادا جان کو بتا
رہیں تھیں اس کہ پاس
بھی ایسی گاڑی تھی
لیکن سیلاب نے کچھ نہ
چھوڑا۔ واپسی پہ دادا جان
میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔
اس وقت ایک لطیف سی
خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔
سال کا10اس وقت میں
تھا۔
مقبوضہ کشمیر میں سرچ
آپریشن کے نام پرلوگوں کہ
گھروں میں گھس کر
توڑپھوڑ۔ احتجاج میں دو
۱۵ ، نوجوان شہید
زخمی۔غرب اردن یہودی آباد
کار فلسطینی نوجوان کو
گاڑی تلے کچل کہ فرار۔ غزہ
اور غرب میں ساڑھے تین
لاکھ فلسطینی بے روزگار۔
شام میں پانچ ہزاریوورینیم بم
گرانے کا امریکی اعتراف۔ شام
میں دو گرہوں میں
افراد ہلاک۔آج کل70جھڑپیں،
خبریں پڑھ کر میرا دماغ ماو
ف ہو جاتا۔ دل اضطراب ٔ
،کیفیت سے دوچار ہوتا ہے
بس نہ چلتا سب کچھ ٹھیک
کر دوں۔ کبھی دل کرتا ان
لوگوں کا گلادبا دوں جنہوں
نے مسلم ممالک میں فساد
پھیلا رکھا ہے۔ لیکن میں پانچ
بہن بھائیوں اور دو بوڑھے
والدین کا واحد سہارا تھا۔

خواہش کو دل میں دبانے کہ
سوا کیا کر سکتا تھا۔
باباجانی سب مسلمان ایک
جسم کی ماند ہیں ناجسم میں
کسی ایک حصے میں درد ہو
توپورے جسم میں وہ درد
محسوس ہوتا ہے۔ باباجان ہمیں
اپنے مسلمان بھائیوں کا
درد کیوں محسوس نہیں ہوتا۔
بابا جانی حشر میں اللہ
پوچھیں گے کہ اپنے
بھائیوں کا حال پتا چل گیا
تھا، مدد کو کیوں نہ
پہنچے۔ کس منہ سے اپنے
نبی سے شفاعت کی
درخواست کروں گا۔ د عا پر
قناعت نہیں کرو ں گا۔ میں
عمل پر یقین رکھتاہوں۔ دوا
بھی کروں گا۔ آوازگلے میں
اٹکنے لگی۔ بابا سر جھکائے
سن رہے تھے۔ سر اٹھا کہ
اشارے سے قریب بلایا۔ میں
ان کہ قدموں جا بیٹھا۔ سر
بابا کہ گھٹنوں پہ رکھ کہ
رونے لگا۔ بابا مجھے درد ہوتا
ہے۔ حوصلہ رکھو میرے
بچے۔ کچھ رقم میرے پاس ہے
باقی میں کچھ لوگوں سے
رابطہ کرتا ہوں وہ بھی
تعاون کریں گے۔ انشااللہ۔ ہم
انہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔
اس وقت مجھے ایک لطیف
سی خوشی کا احساس ہورہا
تھا۔ وہی خوشی جو ریموٹ
گاڑی دینے کے بعد ہوئی
تھی۔

جشن آزادی اسپیشل

آمنہ شہزادی گجرات

لاہور اسٹیشن پر گاڑی رکی
۔۔۔ذلیخا جھریوں بھرے
چہرے سے ندیدوں کی طرح
پاک سرزمین پر آتے جاتے
لوگوں کو دیکھ رہی تھی ۔
اسکی آنکھوں میں وہ منظر
گھومنے لگا جب رام داس
پیشنگوئیاں کرتا تھا ۔ کہ
پاکستان کبھی اپنے پیروں پر
کھڑا نہیں ہو پائے گا ۔ دوچار
سالوں میں پاکستان ناکام ہو کر
دوبارہ ہندوستان کی جھولی
میں آن گرے گا تب ذلیخا اس
کے چوڑے سینے پر مکا برسا
برسا کر نڈھال ہو جاتی ۔
نہیں ایسا کبھی نہیں ہوگا
سال بعد اس70اور آج تقریبا
پاک سرزمین کو دیکھ کر اس
کے روم روم میں توانائی سی
بھر گئی ۔
آج سے ستر سال قبل کی
بات ہے کہ امیر دن کی سات
بیٹیاں اور ایک بیٹا رحمت
تھے ۔ ثمرین 'پروین ' نورین '
شاہین ' نوشین ' عنبرین اور
ذلیخا بیٹیوں کے نام تھے ۔
امیر دین خود تو ان پڑ ھ تھا
مگر وہ جانتا تھا ہندو تعلیم
تجارت اور ہر شعبہ ہائے '
میں ہندئووں سے پیچھے ہیں
کیونکہ ہندو تعلیم کی اہمیت
سے واقف تھے اور مسلمانوں
کے بارے میں انگریزوں کا
خیال تھا کہ وہ مسلمان جو
تعلیم اور کاروبار میں
ہندوئوں سے پیچھے ہیں وہ
ایک علیحدہ وطن کس طرح
تخلیق کرینگے ۔ گر کر
بھی لے لیا تو اس کی
بھاگ دوڑ کیسے سنبھالیں
گے اور اس لئے وہ اپنے
بیٹوں اور بیٹیوں کو تعلیم
دلوانا چاہتا تھا ۔ اس کی
خواہش تھی کہ رحمت پڑھ
لکھ کر ڈاکٹر بنے ۔
جب تحریک پاکستان چلی
امیر دین اپنے پانچ سالہ

بیٹے رحمت کو ساتھ لیکر
آگے آگے ہوتا ۔ امیر دین کی
بیٹیاں کب پیچھے رہنے والی
تھیں وہ بھی تحریک
آزادی کے مضامین ساری ساری
رات ہاتھوں سے لکھتیں
تھیں کیونکہ اس زمانے میں
پرنٹنگ مشین اتنی عام نہ
تھی اور تحریک آزادی کے
مضامین چھپوانے میں بہت
رسک تھا اس لئے یہ
خواتین گھر پر مردوں کی
مدد کرتیں ۔ ذلیخا کا کام
گوند 'سیاہی ' کاغذمضمون
مردوں سے عورتوں تک اور
عورتوں سے مردوں تک
پہنچانا تھا ۔
امیر دین کہتا پاکستان ایک
چھتری کی مانند ہے جو ہمیں
سایہ فراہم کرے گا ۔ چھت
کی مانند دنیا کے سردو گرم
موسم سے محفوظ رکھے گا
تب ذلیخا امیر سے پوچھتی
ابا جان پاکستان بن تو جائے گا
نا!۔ تب امیر دین کی آواز میں
یقین ہوتا ہاں پتر بن کر رہے
گا پاکستان ۔ لے کر رہیں گے
پاکستان ۔ ہم اس کیلئے کوئی
بھی قربانی دینے سے
گریز نہیں کرینگے ۔
14 اگست 1947ء کو آل
انڈیا ریڈیو پر اعلان ہوا کہ
پاکستان تخلیق پا چکا ہے ۔
پاکستان بن گیا ہے ۔
رحمت......رحمت ......ذلیخا
ثمرین ...... پتر جلدی آئو......
۔ امیردین خوشی سے چیختا
ہوا گھر میں داخل ہوا کہ
پاکستان بن گیا ہے ۔ پتر
پاکستان بن گیا ہے ۔ ہمارا
پاکستان ۔
گھر میں موجود واحد
بکری کو حلال کرکے رات
میں دعوت کا اہتمام کیا گیا ۔
تمام رات مہمان خانے سے ابا
جان کے قہقوں کی آوازیں
آتی رہیں ۔ مانو کوئی
خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے ۔
اگلی صبح ابا جان نے
ضروری سامان پیک کیا ۔ کلیم
کے کاغذات اور کچھ نقدی

رحمت کے کپڑوں میں اس
مہارت سے سی کہ ثمرین آپا
حیران رہ گئیں ۔ پھر ہر
بچے کا علیحدہ علیحدہ
تھیلا تیار کیا گیا ۔ سب کو
تھوڑی بہت نقدی بھی
دیدی

اس کے بعد ابا جان نے
سب کو کمرے میں بلا کر بتایا
۔ کل صبح چار بجے ہم اور
تمہارے چچا سجاد یہاں سے
پکی سڑک والی مسجد تک
جائیں گے وہاں باقی قافلہ
تیار ہوگا ۔ پھر صورتحال کے
مطابق پروگرام بنے گا ۔
پاکستان جانے تک کسی
بھی مقام پر ہندو اور
سکھوں سے واسطہ پڑ سکتا
ہے تم سب اگر خطرہ دیکھو تو
بکھر جانا اور ایک دوسرے
کے بجائے اپنی راہ لینا اور
پاکستان جانے والے قافلے کے
ساتھ چلے جانا وہاں جا کر
تم اپنا نام کیمپ میں میری
ہندسہ7ولدیت کیساتھ
لکھنا تاکہ ڈھونڈنے میں
آسانی رہے ۔ میری خواہش ہے
کہ پاک سرزمین دیکھ پائوں ۔
اگر نہ دیکھ پایا تو جو بھی
پاکستان پہنچے سب سے
پہلے شکرانے کے نفل ادا
کرے اور ہو سکتا ہے راستے
میں ہم سے کوئی بچھڑ
جائے اس کو چھوڑ کر آگے
بڑھ جانا ۔ امیر دین نے
بچوں کے چہرے کی طرف
دیکھا تو سب سہمے ہوئے
سے تھے ۔ امیر دین نے
قہقہہ لگایا ماحول سے تنائو
ختم کرنے کو ۔

اور بولا !۔۔۔ طلوع صبح
قریب ہے ۔ آزادی کی صبح جلد
ہم پاکستان میں دیکھیں گے ۔
ضروری نہیں کہ کل
پریشانی سے واسطہ پڑے
بلکہ اب تو ہماری قربانیوں
کا سفر تمام ہوا چاہتا ہے ۔ اب
تو ہم اپنے پاکستان جا رہے ہیں
سب دکھ ۔ پریشانی کو
ہندوستان میں چھوڑکر ۔

ثمرین اور سب بہنیں

مسکرا دیں
***

اگلی صبح امیر دین نے
3بجے رحمت کو سجاد چچا کے
گھر بھیجا ۔ جا پتر چچا کو
لے آئو ۔ نماز پڑھ کر ہم روانہ
ہو جائینگے ۔ رحمت نے
سائیکل اٹھائی اور تیسرے
محلے سے چچا سجاد کو
بلانے چلا گیا ۔
رحمت کو گئے بمشکل
پانچ منٹ ہوئے ہونگے ۔
محلے میں شور اٹھا
بلوائی آگئے
بلوائی آگئے............
تمام مسلمان مرد علاقے
میں واحد کنویں)بائولی (کی
طرف عورتوں کو گھیرے میں
لیکر بھاگے اور رضاکارانہ
طور پر بہنوں بیٹیوں کو
کنویں میں پھینکنے لگے ۔
مگر ہائے ری قسمت کنواں
اتنی زیادہ بیٹیوں کا بوجھ
نہ سہار سکا اور اگل پڑا
۔کنواں بھر گیا
بلوائیوں کا شور لمحہ بہ
لمحہ قریب آرہا تھا
تب مردوں نے بھالے اور
تلواریں جو اپنی حفاظت
کیلئے اٹھا رکھے تھے اپنی
ہی بیٹیوں پر چلانے شروع
کردئیے کیونکہ وہ پاکستان
کیلئے اپنی اور اپنے خاندان
کی جانیں تو قربان کر
سکتے تھے مگر عزتوں کی
قربانی ان کی غیرت کیسے
گوارا کرتی ۔ تب غیر مند
بہو بیٹیاں بھی کیسے
پیچھے رہنے والی تھیں ۔
ایک دوسرے پر فوقیت
لیتے ہوئے جانوں کے
نظرانے پیش کرنے لگیں ۔
جب بلوائی بالکل قریب
آئے ۔ تب ذلیخا کی آواز
گونجی ابا جان مجھے مارئے ۔
کوئی مجھے بھی مارو مگر
بلوائی تو سر پر آگئے تھے
تب نجانے کہاں سے ایک مرد
کے ہاتھ نے ذلیخا کو پکڑ کر
نیچے پھینکا اور ایک دو تین
چار لاشیں ذلیخا کے سر پر

پھینک کر اس کو چھپا دیا ۔
ہندو اور سکھ بہت زیادہ
تعداد میں تھے ۔ مٹھی بھر
مسلمانوں کو انہوں نے جلد
ہی شہید کردیا ۔ اس کے بعد
کچھ بلوائی کنویں میں اتر
گئے اور نیم مردہ لڑکیوں کو
باہر پھینکنے لگے ۔ موت کا
رقص شروع ہو گیا ۔ بلوائی
ان لڑکیوں سے زیادتی
کرنے لگے ۔ ذلیخا کبھی
کبھی آنکھیں کھول کر یہ
منظر دیکھتی تو روح کانپ
جاتی تب ذلیخا دم سادھے
پڑی رہی ۔ اتنے میں یکدم
شروع اٹھا ۔ کنویں سے ایک
عورت کے رونے کی آواز آئی
وہ منت سماجت کر رہی تھی
۔ خدارا! ۔ میں امید سے ہوں
مجھ پر رحم کر و شاید اس
عورت کے گھر والے اسے
کنویں میں چھپا گئے تھے وہ
عورت چیخ رہی تھی مجھے
چھوڑ دو ۔ ایک ماں کو اپنے
بچے کے آگے بے آبرو مت
کرو ۔
ہندو بلوائیوں‌نے اس
عورت کے کپڑے پھاڑ دئیے ۔
اس نے واسطے دئے جب وہ
برہنہ ہو گئی ۔ چیخ کر
آسمان کی طرف دیکھا اور
بولی ۔ اللہ میری عزت کی
حفاظت فرما ۔ تب ایک
بلوائی نے تلوار سے اس
عورت کا شکم چاک کر دیا ۔
افففف۔ یہ منظر دیکھ کر
آنکھیں پتھرا گئیں ۔ تب
ایک دوسرا بلوائی آیا اور
عورت کے پیٹ سے بچے کو
نیزے پر اچھا لا ۔ مانو ایک
گھنائونا کھیل مل گیا ۔ بچے
کو نیزے اور بھالے پر اچھال
اچھال کر سب کھیلنے لگے ۔
ذلیخا اس منظر کی تاب نہ
لاسکی اور بیہوش ہو گئی
۔ بلوائی جب اس کھیل سے
تھک گئے تو مردہ جسموں
کو نیزوں اور بھالوں سے
چھلنی کرنے لگے اور نعرے
لگاتے چلے گئے ۔
ادھر رحمت جب چچا سجاد

اور ان کی بیٹی یسری کے
ساتھ واپس آیا تب آدھے
گھنٹے میں پورا علاقہ تباہ ہو
چکا تھا)ذلیخا بیہوشی
کی وجہ سے ان کی آمد سے
بے خبر رہی (رحمت رونے
لگا مگر چچا سجاد اس کو لے
کر پاکستان روانہ ہو گئے ۔
راستے میں کئی مقامات پر
بلوائیوں سے واسطہ پڑا مگر
چچا سجاد شہیدوں کا خون
خود پر ' رحمت پر اور یسری
پر مل کر مردہ ہونے کی
اداکاری کرتے ۔ اسطرح
گرتے پڑتے رحمت پاکستان
پہنچ گیا ۔ وہاں پہنچ کر نفل
نماز پڑھی اور روزانہ ریلوے
اسٹیشن جانے لگا کہ شاید
کوئی بچ گیا ہو کوئی اپنا
جو اس کو ڈھونڈ رہا ہو ۔ مگر
شاید کوئی نہیں تھا ۔ ادھر
جب لاشیں اٹھانے ٹرک آیا ۔
پہلے لاشوں پر پانی پھینکا
گیا ۔ نیم جان لوگوں کو
ہسپتال پہنچایا گیا مگر
ہسپتال میں بھی کوئی
مسلمان محفوظ نہیں تھا ۔
ہر جگہ بلوائی پہنچ جاتے
تھے ۔ ایسے میں ذلیخان نے
جب حرکت کی رام داس کی
نظر اس پر پڑی ۔ رام داس
ایک35سالہ ہندو جوان تھا
اس نے ذلیخا پر چادر ڈالی
اور ذلیخا کو اپنے گھر لے آیا
۔ اپنی ماتا رام کٹوری سے
بولا ۔ میں تیری خدمت کو یہ
مسلی بچی لے آیا ہوں ۔
رام کٹوری کو تو جیسے
کرنٹ سا لگ گیا ۔ چھی ۔
چھی ۔ چھی --- یہ مسلی
میری کیا خدمت کرے گی ۔
الٹا ہمارا دھرم بھرشت کرے
گی ۔ اسے واپس چھوڑ آیا یا
مار ڈال مگر رام داس نے یہ
بات ماننے سے انکار کردیا
جب گلی محلے اور رام
کٹوری کا دبائو زیادہ پڑا تو
رام داس نے آٹھ سالہ ذلیخا
کو جبری ہندو بنا کر اس سے
زبردستی شادی رچالی ۔
تب ذلیخا نے چائے پینے کی

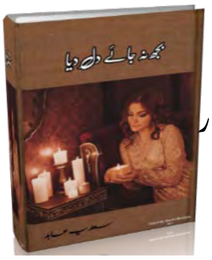
فرمائش کی اور خود چائے
بنانے گئی اور مٹی کے
چولہے کا تمام تیل اپنے بدن
اور ٹانکوں پر انڈیل کر آگ
لگادی ۔
ذلیخا کو پاکستان دیکھنے
کی خواہش نے مرنے تو نہ
دیا مگر اب وہ کسی مرد کے
لائق نہ رہی ۔ اس کے بعد
ذلیخا جب ہوش میں آتی
چیختی ۔ کلمہ پڑھتی اور
کہتی ہمارا پاکستان بن چکا
ہے ۔ اب ظالموں کو کہیں امان
نہیں ملے گا ۔ میرے مسلمان
بھائی واپس آئیں گے ۔
ایک نئی طاقت بن کر اور
اپنی بہنوں کو واپس لے
آئیں گے ۔ تب رام داس کہتا ۔
پاکستان جلد ناکام ہو کر دوبارہ
ہندوستان کی جھولی میں آن
گرے گا مگر ذلیخا لڑ سی
جاتی ۔ ذلیخا کا نیا نام چندہ
بائی رکھ دیا گیا اور اس کو
سندور دیا جانے لگا جس سے
اس کی آواز بند ہوگئی ۔
*****
یہ عید سے ایک روز پہلے
کی بات ہے کہ رحمت
اسٹیشن پر ٹھہرا تھا ۔ ایک
مال گاڑی آئی سب بھاگے
شاید اپنوں کا کوئی سراغ
ملے مگر یہ کیا گاڑی میں
بچوں اور عورتوں کے کٹے سر
۔ بچوں کے اعضاء ۔ عورتوں
کی چھاتیاں پڑی ہوئی
تھیں ۔ ساتھ میں لکھا ہوا
تھا کہ مسلمانوں کیلئے عید
کا تحفہ ۔۔اس کے بعد
رحمت کی کبھی اسٹیشن
جانے کی ہمت نہ ہوئی ۔
رحمت نے اپنے باپ کے خواب
کو تعبیر دی ڈاکٹر بن گیا ۔
سجاد چچا نے کنزی سے
رحمت کی شادی کرادی اب
تو رحمت کے چار بیٹے اور
تین بیٹیاں تھیں ۔
*****
کئی سال گزر جانے کے
باوجود ذلیخا کو زبان بندی
کی دوائیاں دی جاتیں
تھیں ۔ کئی سال گزر جانے

کے بعد زبان بندی کی دوا
دینی تو بند کردی گئی
تھی مگر ذلیخا توتلا
بولتی تھی ۔ دوائیوں کا
اثر آج بھی ذلیخا کی زبان
پر تھا ۔ رام داس مر چکا
تھا ۔ رام داس کی دوسری
اولادیں تھیں ۔6بیوی سے
ان میں اشوک)ذلیخا (چندہ
بائی سے بہت نزدیک تھا
کیونکہ چندہ بائی نے بھی
تمام عمر ان بچوں کی خدمت
میں گزار دی تھی ۔ آج
اشوک نے چندہ بائی سے
پوچھا پیارہ چندہ بائی کیا آپ
کے خاندان کا کوئی باقی
نہیں رہا ہوگا ۔ تب چندہ
بائی کی نظروں میں رحمت
کا معصوم چہرہ آگیا وہ بولی
کیوں نہیں میرا بھائی ۔
میرا رحم مت ۔۔۔
کیا؟۔۔۔ چند بائی وہ آپ کے
سامنے آئے تو آپ اسے پہچان
لیں گی ۔ تب ذلیخا نے
گردن انکار میں ہلادی ۔ شاید
پتہ تھا نہیں۔ چند بائی
میں اگر آپ کو آپ کے
بھائی کا پتہ معلوم
کردوں تو آپ کیا انعام دیں
گی ۔ چندہ بائی کی آنکھیں
چمک اٹھیں مگر کیسے ۔
اشوک بولا !۔ ارے چندہ
بائی آجکل سوشل میڈیا نیٹ
ورک پر بچھڑے رشتہ دار
مل رہے ہیں ۔ آپ کا بھائی
اور والد کا نام بتائیں اور یوں
اشوک نے فیس بک پر
رحمت کی تلاش شروع کردی
۔ ایک روز فیس بک پر
رحمت اور سجاد کی تصویر
دیکھ کر ذلیخا چیخ پڑی تب
ذلیخا رحمت کیساتھ چچا
سجاد کو پہچان گئی اور
رحمت ولد امیر دین لکھا
دیکھ کر وہ بھائی کو
پہچان گئی ۔ یوں سلام دعا
کے تبادلے ہوئے اشوک نے
چندہ بائی کو پاکستان روانہ
کر دیا اور اب ذلیخا لاہور
ریلوے اسٹیشن پر بیٹھی
گزرے وقت کی گرد اپنے ذہن



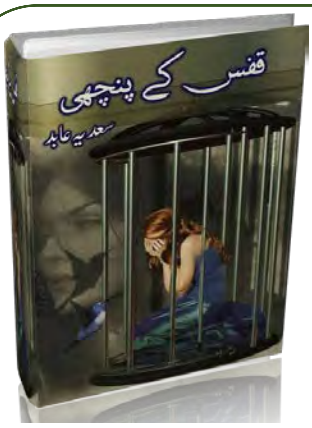
عہدِ وفا

ایمان پریشے کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا مُنفرد ناول، مُحبت کی داستان جو معاشرے کے رواجوں تلے دب گئی، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



بُجھ نہ جائے دِل دیا

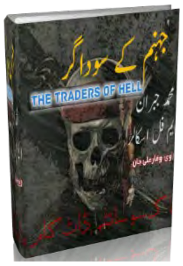
سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، مُحبت، نفرت، عداوت کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



قفس کے پنچھی

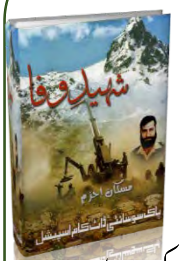
سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے جلد، **کتابی شکل** میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔

آن لائن پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



جہنم کے سوداگر

مُحمد جبران (ایم فِل) کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ایکشن ناول، پاکستان کی پہچان، دُنیا کی نمبر 1 ایجنسی آئی ایس آئی کے اسپیشل کمانڈو کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



شہیدِ وفا

مُسکان احزم کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ناول، پاک فوج سے مُحبت کی داستان، دہشت گردوں کی بُزدلانہ کاروائیاں، آرمی کے شب و روز کی داستان پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

آپ بھی لکھیے:

کیا آپ رائٹر ہیں ؟؟؟۔ آپ اپنی تحاریر پاک سوسائٹی ویب سائٹ پر پبلش کروانا چاہتے ہیں ؟؟؟

اگر آپکی تحریر ہمارے معیار پر پُورا اُتری تو ہم اُسکو عوام تک پہنچائیں گے۔ مزید تفصیل کے لئے یہاں کلک کریں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام، پاکستان کی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی کتابوں کی ویب سائٹ، پاکستان کی ٹاپ 800 ویب سائٹس میں شُمار ہوتی ہے۔

سے صاف کر رہی تھی ۔
ٹرین رکنے پر ذلیخا کے پیروں
میں بجلی سی بھر گئی ۔
باہر رحمت آیا ہوا تھا ۔
رحمت کو لنے پر ذلیخا
چیخنے لگی ۔
گھر جا کر تعارف ہوا۔ تب
نگہت بولی پھپھو آپ کتنی
مشکلات اور تکالیف
برداشت کرکے پاکستان آئی
ہونگی اور یہاں کسی کو
پاکستان کی قدر ہی نہیں ۔
تب یسری نے نگہت کو
آنکھیں دکھائیں ۔ نگہت
چپ ہو گئی ۔
کچھ روز بعد ڈائننگ ٹیبل
پر میچ کا تذکرہ ہو رہا تھا
تب میچ فکسنگ زیر بحث
تھی تبھی چھوٹی طوبی
بولی اللہ کرے پاکستان
ہارجائے مجھے تو دھونی
پسند ہے یہ سنتے ہی ذلیخا

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ایک عورت گالف کھیل رہی تھی کہ ایک ہٹ کے بعد اس کی گیند قریبی جنگل میں جا گری، بال ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ جھاڑیوں میں پہنچ گئی جہاں گیند پڑی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ادھر ایک مینڈک کانٹے دار جھاڑی میں پھنسا ہوا ہے۔ مینڈک نے عورت کو دیکھ کر کہا،
خاتون اگر آپ مجھے ان کانٹوں سے نجات دلا دیں گی تو میں آپ کی تین خواہشات پوری کروں گا۔ یہ سن کر خاتون نے فوراً ہاتھ بڑھا کر مینڈک کو کانٹوں سے نجات دلا دی۔
مینڈک نے کانٹوں سے نجات پا کر شکر ادا کیا اور خاتون سے کہنے لگا جی اب آپ کہیں کیا خواہش ہے آپ کی، مگر میں معافی چاہتا ہوں کہ میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ آپ جو کچھ مانگیں گی، آپ کے شوہر کو وہی چیز دس گنا ملے گی۔
خاتون کو یہ سن کر بڑا غصہ آیا، خیر انہوں نے کہا کوئی بات نہیں۔
میری پہلے خواہش ہے کہ میں دنیا کہ سب سے خوبصورت عورت بن جاؤں۔ مینڈک نے کہا سوچ لیں آپ کا شوہر دس گنا خوبصورت ہو جائے گا؟
کوئی بات نہیں، میں سب سے خوبصورت ہوں گی، تو وہ مجھے ہی دیکھے گا خاتون نے کہا۔ مینڈک نے کوئی منتر پڑھا اور خاتون بے حد خوبصورت ہو گئی۔
دوسری خواہش کہ میں سب سے امیر ہو جاؤں۔ مینڈک نے کہا سوچ لیں آپ کا شوہر آپ سے بھی دس گنا امیر ہو جائے گا؟ خاتون نے کہا کوئی مسئلہ نہیں اس کی دولت یا میری، ایک ہی بات ہے۔ مینڈک کا منتر اور وہ خاتون شوں کر کے امیر-----------------
جی خاتون آپ کی تیسری خواہش؟ مینڈک نے پوچھا؟
مجھے ایک ہلکا سا دل کا دورہ یعنی ہارٹ اٹیک ہو جائے-----------------------
اس کہانی کا سبق: خواتین بہت چالاک ہوتی ہیں، ان سے زیادہ ہوشیاری اچھی نہیں------------
.
.
.
خواتین پڑھنے والیوں کے لیے: یہ لطیفہ ختم - اب آپ آرام سے اس سے مزے لیں اور بس-----
.
حضرات آپ آگے پڑھیں--- آپ کے لیے کچھ اور ہے آگے-----------
جی جناب - خاتون کے شوہر کو خاتون کے مقابلے میں دس گنا ہلکا ہارٹ اٹیک ہوا۔
اس کہانی کا سبق: خواتین خود کو بہت عقلمند سمجھتی ہیں حالانکہ ایسا ہے نہیں
انہیں یہ سمجھتے رہنے دیں اور محظوظ ہونے دیں

قادری صاحب چہرے پہ بے تحاشہ برہمی و غصے کے تاثرات لئے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور چیخ کے بیگم کو آواز دی،

بیگم بیچاری گھبرا کے آئی اور بولی خیر تو ہے؟ کیا ہوگیا؟

قادری صاحب نے اپنے دیرینہ، جگری اور گہرے دوست کے نام کا حوالہ دیکر پوچھا، "تم شیخ صاحب کے گھر گئی تھیں اور تم نے ان سے کہا کہ وہ مجھ سے کہے کہ میں تمہیں شاپنگ کے لئے پیسے دوں؟"

"ہاں گئی تھی، اور کہا بھی تھا" بیگم نے اقرار کیا

کیا؟؟؟؟؟؟؟ قادری صاحب تقریباً دھاڑتے ہوئے بولے، شاید انکو بیگم سے سچ کی توقع نہیں تھی،

"کیا میں زندہ نہیں تھا؟ کیا کام سے میری واپسی نہیں ہونی تھی؟ مر گیا تھا میں؟ مجھ سے ڈائرکٹ کیوں نہیں مانگے پیسے؟ شیخ سے کہلوا کر کیوں مانگے؟"

"اللہ نہ کرے! مانگنے تو آپ ہی سے ہیں، بس شیخ صاحب آپ کے اتنے قریبی دوست ہیں تو ان سے جا کر بول دیا کہ آپ سے کہیں کہ آپ مجھے پیسے دے دیں" بیگم نے معصومیت سے کہا۔

قادری صاحب کا غصہ سوا نیزے پہ پہنچ گیا، "دماغ درست ہے تمہارا؟ گھر میں موجود اپنے شوہر کو چھوڑ کر تم گھر سے نکلیں، گھر سے باہر نکل کر میرے دوست کے پاس جا کر کہہ رہی ہو کہ وہ مجھے بولے، وہ کیوں بولے مجھ سے؟ تم نے بذات خود کیوں نہیں کہا مجھ سے؟"

"ارے وہ آپ کے اتنے قریبی دوست ہیں، آپ کی نظر میں انکی بات کی اہمیت بھی ذیادہ ہوگی" بیگم نے قادری صاحب کے غصے کو گویا ہوا میں اُڑا کر بدستور نرم اور معصوم لہجے میں کہا۔

قادری صاحب نے خود کو اپنے بال نوچنے سے بڑی مشکل سے روکا اور پھنکارتے ہوئے بولے، "دوست کی بات کی اہمیت، اسکی اپنی باتوں کے لئے ہے، اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ میری بیوی، میرے بچے، میرے والدین یا میرے بہن بھائی اپنی ضرورت کے لئے مجھ سے کہنے کے بجائے جا جا کے میرے دوستوں کو بولیں گے تب میں سنوں گا ورنہ نہیں، ارے جو میرے اپنے ہیں وہ اپنی ضرورت مجھ سے نہیں بولیں گے تو کس سے بولیں گے؟

دوست جتنا بھی قریبی ہو، کیا میں نے کہا تم لوگوں سے کے اپنی ضرورت میرے دوست سے بولوگے تو پورا کروں گا ورنہ نہیں؟ کیا میرے دوست نے تم سے کہا کہ میرے پاس آؤ اور اپنی ضرورتیں اور مسائل اسے بتائو؟ کیا آج تک میں نے تم لوگوں کی ضرورت پوری کرنے میں کوئی کوتاہی کی جو تم دوست کے پاس چلی گئیں؟ بولو جواب دو؟ ذلیل کروا دیا تم نے مجھے آج میرے دوست کے سامنے، کیا سوچتا ہوگا وہ میرے بارے میں-----" قادری صاحب بولتے بولتے رونے والے ہوگئے-

بیگم نے اس بار بڑی سنجیدگی سے کہا، "معافی چاہتی ہوں، ایک چھوٹے سے خاندان کا سربراہ ہوکر آپ کا غصہ سوا نیزے پہ پہنچا ہوا ہے کہ آپ کے خاندان کے ایک فرد، یعنی میں، نے کسی غیر سے نہیں بلکہ آپ کے ہی ایک دوست سے سفارش کیوں کروائی جبکہ آپ کا روز کا معمول ہے کہ خالقِ کائنات کی مخلوق ہوتے ہوئے آپ کبھی دامادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مشکل کشائی کروانا چاہتے ہیں، کبھی بابا فرید کے در سے کاروبار کی ترقی کروانا چاہتے ہیں، کبھی سہون کا رخ کرتے ہیں تو کبھی شیخ عبدالقادر جیلانی رح کو پکارتے ہیں، منع کیا جائے تو جواب ملتا ہے، مانگ تو ہم اللہ ہی سے رہے ہیں، مگر اس کے سچے دوستوں کے وسیلے سے"

کیوں؟ دوستوں سے کیوں؟
آپ ہی کے بقول، کیا اللہ میاں نعوزباللہ چھٹی پہ گئے ہوئے ہیں؟
مسجد یا گھر میں پانچ وقت کی اذان میں ہمارا رب ہمیں "فلاح یعنی کامیابی" کی طرف بلا رہا ہے آپ جاتے کیوں نہیں اور جاتے ہیں تو کیا نماز میں اسے اپنی ضرورت نہیں بتا سکتے؟
اور جب اللہ کواپنی حاجت بتا دی تو کیا ضرورت رہ جاتی ہے کہ بزرگوں کے دروں کے چکر لگائے جائیں؟
کیا ان بزرگ ہستیوں نے کبھی کہا کہ اللہ نے ہمیں تمہاری مشکلات دور کرنے کا حق "عطا" کیا ہے؟
کیا اللہ نے کہا کہ مجھے میرے دوستوں کے زریعے سے پکارو گے تو سنوں گا؟"
"جب آپ کو اپنی معمولی سربراہی میں اپنے عزیز ترین دوست کی شمولیت گوارہ نہیں تو تو خالقِ کائنات سے اسکی امید کیوں رکھتے ہیں؟"

غالباً آپ سجھ گئے ہونگے کہ میں آپ کے دوست کے پاس کیوں گئی تھی؟ بیگم نے بات ختم کی اور کمرے سے نکل گئیں، قادری صاحب ایر کنڈیشن کھول کر پسینہ سکھانے لگے-

انتخاب --
انعم شہزادی گجرات

....

....
جو لوگ مولویوں سے بیزار ہیں ان کے لئے میرا مفت مشورہ ہے کہ ابھی سے وصیت لکھ دیں کہ ان کا جنازہ کوئ مولوی نہ پڑھاے !!!!!!......
اور غیرت کا مظاہرہ کرتے ہوے نکاح کے وقت بھی کسی مولوی کا انتخاب نہ کریں
بلکہ کسی پنڈت یا دانشور کو ہی بلایں .... !!!!!!!
اور جب بچے کی پیدائش ہو تو اذان کے لئے کسی مولوی کو دعوت ہرگز نہ دیں بلکہ کسی ماہر مفکر سے رابطہ کریں .!!!
پیدائش سے قبر تک مولوی تمہارے کام آتا ہے پھر کس منہ سے مولویوں کے خلاف مغلظات بکے جاتے ہیں پھر اسی گندے منہ سے جب مولوی کو بلایا جاتا ہے تو وہ بیچارہ پھر بھی آ ہی جاتا ہے ....
سچ پوچھو تو تم کو تکلیف مولوی سے نہیں اسلام سے ہے . مولوی کے بہانے سے تم اسلام پر حملہ آور ہوتے ہو .....)

محمد سفیان گوجرانوالہ

....

"اسکی یہ ڈیمانڈ ہے کہ تم داڑھی شیو کر لو تو پھر ہی وہ شادی کرے گی"، عمر کہ امی اسکے قریب آ بیٹھی تھیں۔
عمر کو یہ خبر سن کر دھچکا سا لگا۔ ساتھ ہی دل پر تکلیف کا ایک بھاری بوجھ آن گرا،

"کیا؟؟؟
یہ سعدیہ نے کہا۔۔؟؟"، اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ شادی کو صرف ایک ہفتہ رہ جانے پر منگیتر کی طرف سے ایسی بات سننا۔۔ اور وہ بھی اس حال میں کہ اب دل میں جگہ بن چکی ہو، محبت سی محسوس ہونے لگی ہو۔۔ تکلیف کا عالم ناقابلِ بیاں تھا۔

"ہاں بیٹا، مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا، اس لیے خود اس سے ہی پوچھ کر آ رہی ہوں۔
میری مانو تو اسکی مان لو۔ کیا ہے اس میں۔ ایک داڑھی ہی کی تو بات ہے۔ آجکل تو لوگ دو ٹکے کی جاب کے لیے بھی داڑھی چھوڑ دیتے ہیں، تو تمہارا تو پوری زندگی کا سوال ہے بیٹا۔ اتنی اچھی لڑکی ہے، پڑھی لکھی، خوبصورت ، جوان، اچھا خاصا خاندان ہے، خود وہ ڈاکٹر ہے، اور کیا چاہیے۔۔ اب ضد نہ کرنا بیٹا"، سارہ صاحبہ بیٹے کو سمجھانے لگیں۔

پہلے منگیتر، اب ماں۔۔ اور کس کس کا مقابلہ کرنا پڑنا تھا۔ عمر کا صدمے سے حلق گھُٹنے لگا تھا۔
"امی جان۔۔ جب اس نے مجھے پہلے قبول کیا تھا تو اس داڑھی کے ساتھ ہی کیا تھا۔ آج اگر ڈاکٹر بن کر اسکی سوچیں آسمان پر پہنچ گئی ہیں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں"، دل غم سے چُور چُور تھا۔

* * * *

"ایک طرف دل ہے، اور دوسری طرف ایمان۔۔
ایک جانب دنیا قدموں میں ہے، اور دوسری جانب اللہ۔۔
ایک رستہ دل پسند زندگی کی طرف جاتا ہے، اور ایک ہجر کی تنہائیوں کی طرف۔۔"، عمر سُنسان پارک میں بیٹھا خود سے مخاطب تھا۔ آج بہت بڑا امتحان لے لیا تھا اس سے اس کے رب نے۔ آج پتا چلنا تھا جو دین دین کے نعرے لگانے والا عمر تھا وہ واقعی دل سے ایمان لایا تھا یا رب سے محبت کے سارے دعوے کھوکھلے تھے۔

عمر کے زہین سے پرانی، خوبصورت یادیں گزرنے لگیں۔
وہ جب پہلی مرتبہ سعدیہ کے گھر گئے تھے۔ جب رشتے کے لیے ہاں ہوئی تھی۔ دوستوں کا شادی کی خبر پر چھیڑ چھاڑ، ہنسی مزاق۔۔۔
عمر کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔۔

"ایک داڑھی کی بات نہیں ہے۔۔
میری پوری آخرت کی بات ہے۔۔"، پلکوں پر کچھ قطرے نمودار ہوئے۔

"اللہ اکبر، اللہ اکبر۔۔"، قریبی مسجد سے اذان گونجنے لگی۔

"اللہ اکبر۔۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔۔
اف !! بےشک اللہ سب سے بڑا ہے، سب سے پہلے بھی ہے، اور سب خواہشات سے اوپر بھی ہے۔۔"،عمر دل ہی دل میں بےاختیار کہہ اٹھا۔

"آج مجھے بھی ایک بدر لڑنی ہے۔ ایک اُحد پر قربان ہونا ہے۔۔۔ پر میری دفعہ میدان میرا دل بنا ہے۔۔
ہر خواہش قربان ہے تُجھ پر میرے اللہ۔۔ اس دل پر آج میں خود چھُری چلا دوں گا۔۔"، دُکھ سے آواز رند گئی

تم کیا جانو کہ ادائے ابراہیمی کیا ہے
رب کی رضا کی خاطر خود کا دل دُکھا دینا

* * * * * *

(ایک سال بعد۔۔)

"آئیں نا پہلے کھانا کھا لیں پلیز۔۔"، آمنہ محبت سے اپنے شوہر سے گویا تھی۔

"ابھی ایک گھنٹے تک کچھ نہیں کر سکتا آمنہ، آج واقعی بہت کام ہے"، عمر نے لیپ ٹاپ تھوڑا اور قریب کرتے ہوا جواب دیا۔

"۔۔میں نے بھی ابھی تک کچھ نہیں کھایا کہ آپ کے ساتھ ہی کھاؤں گی۔۔"، آمنہ نے کچھ دیر خاموشی سے پاس بیٹھنے کے بعد دھیمی سی آواز میں کہا۔

"کیا۔؟ ارے پہلے کیوں نہیں بتایا۔؟؟"، عمر نے سب کام چھوڑ کر اپنا رُخ پوری طرح اپنی بیوی کی جانب پھیر لیا۔

"۔۔اور اب بہت بھوک لگ رہی ہے۔۔"، آمنہ نے سوال نظر انداز کرتے ہوئے دُکھی سا منہ بنایا۔

"ہاہاہا۔۔ "، عمر اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

"حیرت ہے میڈم کو تو ایک منٹ بھوک برداشت نہیں ہوا کرتی، آج تین گھنٹے کیسے گزار لیے؟؟"

آمنہ بھی مسکرا دی۔ "لگاؤں پھر کھانا؟"

"جی جناب، ملکۂ عالہ بھوکی ہوں اور ہم خیال نہ کریں، ایسا ممکن ہے بھلا؟"، عمر شرارتاً اس سے گویا تھا۔ لیپ ٹاپ اب بند کر چکا تھا اور چارجر اتار کر واپس رکھ رہا تھا۔

آمنہ شرماتی آنکھوں سے ہنستے ہوئے کچن کی جانب چل دی۔

سعدیہ کے ٹھکرا دینے کے معاملے کو ایک سال بِیت چکا تھا۔ عمر نے اپنی منگیتر اور سُنت کی داڑھی میں سے سنت کو چُنا تھا۔ اس فیصلے پر وہ دنیادار لوگوں کی نظر میں بےوقوف ترین ٹھہرا تھا، اپنوں، حتٰی کے والدین تک کے طعنے اور گالیاں سنی تھیں ، اور خاندان والوں کی باتیں الگ۔۔

خاندان والے کتنی باتیں بنائیں گے۔۔ داڑھی جب تک ہے کوئی اچھا رشتہ نہیں ملے گا۔۔ تم نے تو ذلیل کر دیا ہے بوڑھے ماں باپ کو اپنی ضد کی خاطر۔۔ وغیرہ وغیرہ جیسی باتیں پورا ایک سال اکیلا ہی سنتا رہا۔ جس کا جو دل میں آیا کہتا رہا۔ لیکن عمر کا فیصلہ ایک دن کے لیے بھی نہ بدلا۔
ہاں تکلیف تو بہت ہوتی تھی ایسے رویوں سے لیکن اللہ کا قرآن اور ذکر ایسی چیزیں تھیں جو اسکی ہمت بنی رہیں۔ سچ ہے نماز اور ذکر نہ ہو تو انسان تو پاگل ہی ہو جائے۔
اللہ نے ایسے صبر پر استقامت بھی پھر کمال کی عطا کر دی تھی۔ حقیقی بات ہے کہ وہ رب اپنی خاطر اُٹھے انسان کو کبھی مرنے کے لیے اکیلا نہیں چھوڑ دیتا۔ لیکن اس لیول پر آنے کے لیے پہلا قدم خود اُٹھانا پڑتا ہے۔ ثبوت دینا پڑتا ہے کہ واقعی آپ کے لیے اللہ ہی سب سے زیادہ قیمتی ہے۔۔ اس کے بعد ڈرپوک سے ڈرپوک ترین انسان کا دل بھی پہاڑ کی طرح مضبوط ہو جاتا ہے۔ اسے وہ مضبوطی عطا کر دی جاتی ہے جو اس کے قدموں کو رب کے رستے پر جما دے ، اسطرح کہ پھر دنیا کی کتنی بھی سخت ہوائیں چلیں اسے گرا نہیں سکتیں، اس رستے سے ہٹا نہیں سکتیں۔۔
لیکن اس راہ پر صرف دکھ ، تکلیف اور محرومیاں ہی نہیں ملتیں بلکہ انسان وقتاً فوقتاً انعام سے بھی نوازا جاتا ہے۔۔ جیسے آج عمر کو نوازا گیا تھا۔ عرصے کے گھُپ اندھیروں اور طوفانوں کے بعد اسکی کشتی کو بھی کنارے لگا دیا گیا تھا۔ اسے آمنہ جیسی ایمان والی، محبت کرنے والی، شرم و حیا والی ایک پردہ دار، خوبصورت بیوی عطا کر دی گئی تھی۔ سعدیہ کو اللہ کے لیے کھو دینے پر اس کو دنیا میں ہی جنت سی دے دی گئی تھی۔
عمر کو کبھی کبھی لگتا تھا جیسے اللہ نے اسکی ساری فِیلنگز کو سمیٹ کر ایک انسان کا رُوپ دے دیا ہو، آمنہ کے نام سے۔ جیسے وہ حقیقتاً کوئی انسان نہیں تھی بلکہ عمر کی ضرورتوں کا جوابی عکس، اسکی آنکھوں کی ٹھنڈک، اسکی روح کا سکون۔۔
جبکہ دوسری جانب، سعدیہ، اسے ٹھُکرا دینے پر آج بھی کنواری بیٹھی تھی۔
وہ شاید بھول گئی تھی کہ جسے ایک داڑھی سمجھ کر ٹھُکرا رہی تھی، وہ محض ایک داڑھی نہیں تھی، بلکہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔ اصل میں توہین اس نے عمر کی نہیں کی تھی بلکہ اللہ اور اسکے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کی تھی۔ اور یہ کوئی چھوٹا جُرم نہیں تھا۔ سعدیہ کی طرح آج کتنے ہی نام نہاد مسلمان داڑھی، پردہ، ٹخنوں سے اوپر پائنچے اور دین کی دوسری کئی باتوں کے لیے کتنے آرام سے نفرت آمیز رویے کا اظہار کرتے رہتے ہیں، ان پر عمل کرنے والوں کا مزاق اُڑاتے رہتے ہیں۔۔ یہ سوچے بِنا کہ ان کا یہ سب کرنا انکو تباہی کے کس کس گڑھے میں پھینکتا جا رہا ہے، انھیں تباہ و برباد کرتا جا رہا ہے۔۔ زندگی سے سکون ایسے ہی نہیں چھِن گیا ایسے لوگوں کے !!

نبی کے صحابہ کے رستے پہ چل کے
دلوں کا سکوں ہم نے حاصل کیا ہے
لگا ہے نشہ جب سے جنت کا ہم کو
اُچاٹ اپنا جی اس جہاں سے ہوا ہے۔۔

....

انتخاب۔۔۔
شازیہ پروین میواتی
پتوکی

امی بڑے بنگلوں سے گوشت آئے گا!!!!!! بکرا عید کا دن تھا.آس پاس محسورکن خوشبو رچی بسی تھی.اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر امید ناامیدی سے ماں کی طرف دیکھ کر پوچھا.اس نے ایک نظر اپنے بیٹے کے کمزور چہرے کی طرف دیکھا.اور دل میں درد کی لہر اٹھی. جیسے کیسی نے دل میں خنجر گھونپ دیا ہو.کیسی حسرت و یاس ٹپک رہی تھی آٹھ سالہ احمد کے چہرے سے.یہ تو اسے بھی نہیں پتہ تھا سوال مشکل تھا.جواب نہیں تھا اس کے پاس .آنسو کے امڈتے سیلاب کو بمشکل پیچھے دھکیلا اوراثبات میں سرہلادیا . وہ انکار نہ کرسکی۔۔ وہ کیسے انکار کرتی۔۔ کیسے اس معصوم کا دل توڑتی .لیکن جب صبح سے شام ہوگئی .تو احمد کی بھوک غصہ انتقام اور درد بن کر باہر نکلا ...اس کا دل بری طرح کانپنے لگااس نے حیران ہوکر چھوٹے سے معصوم سے بیٹے کی جانب دیکھا .امی یہ بڑے بنگلوں والے بڑے لوگ بہت چھوٹے ہیں.بہت برے ہیں .امی میں میں ان لوگوں کو نہیں چھوڑونگا..میں بڑا ہوکر ان سے ان کا بدلہ لونگا..نہیں چھوڑونگا.نہیں چھوڑونگا امی میں نہیں چھوڑونگا آج کا دن نہیں بھولونگا وہ غم وغصے سے کہہ رہا تھا.اور اس کی ماں بےدم سی ہوکر زمین پر بیٹھتی چلی گئی.اس طرح بھی بنتے ہیں.چور .دہشت گرد.جو پیدائشی مجرم نہیں ہوتے..کچھ کو مجبور کیا جاتا ہے..اس راہ کے لئے..پھر جلدی سے یہ کہ کر جان چھڑا لیتے ہیں کہ زمانہ خراب ہے.

.راحیلہ بنت مہرعلی شاہ.گاوں آماخیل ضلع ٹانک

....

نوالہ نہیں

ثمینہ نازی سرگودھا
"زندگی محنت کی محتاج ہے" غربت انسان کے لیے ایک آزمانش بھی قرار دی جاتی ہےاور آج کے دور میں غربت کو "لعنت" سمجھا جاتا ہے.اگر دیکھا جاے تو غربت ایک ایسی دلدل ہے جس میں انسان پھنستا جاے تو وہ پھنستا ہی جاتا ہے,اور اگر نکلنے کی کوشش بھی کرے تو وہ آ سانی سے نکل نہیں پاتا ہے.اُس کے لیے اُسے دن رات محنت کرنا پڑتی ہےاور پھر مہینوں سالوں کے بعد وہ اِس غربت سے اپنی جان

چھڑا پاتا ہے.ایسے ہی ایک نوجوان نے اپنی محنت اور لگن سے اپنے گھر کو غریبی سے آزاد کرایا."عاصم" ایک چھوٹے سے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا.وہ نویں جماعت میں تھا جب اُس کی والدہ بلڈپریشر کی بیماری کی وجہ سے وفات پا گئی تھیں.اُس کے والد کاروبار میں نقصان ہونے کی وجہ سے ریڑھی لگانے پر مجبور ہو گےتھے,کیونکہ گھر میں "عاصم"کی تین بہنیں بھی موجود تھیں اور کفالت کرنے والا صرف ایک انسان تھا."عاصم"کی بڑی بہن بہت تیزی سے جوانی کی سیڑھیوں کو عبور کرتی جارہی تھی اور اب اُس کی شادی کی عمر ہو چکی تھی,بہت مشکل سے ایک رشتہ پسند آیا تو انہوں نے بھاری جہیز کی مانگ کی."عاصم"کے گھر والوں کے لیے یہ بہت پریشانی کی بات تھی.جب وقت پر جہیز کا انتظام نہ کر سکے تو لڑکے والے رشتہ توڑ کر چلے گے.پہلے غربت کی وجہ سے"عاصم"کی ماں کی موت ہو گئی اور اب بہن کا رشتہ ٹوٹ گیا.یہ صدمہ سب گھر والوں کو شدت سے غربت کا احساس دلا گیا."عاصم"کے والد تو اس صدمے کے بعد خاموش سے رہنے لگے شاید وہ غربت سے ہار مان چُکے تھے."عاصم"سے اپنے گھر والوں کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی.ایک دن وہ دلبرداشتہ ہو کر گھر سے نکل پڑااور دن رات ایک کر کے محنت مزدوری کرنے لگا,اُسے ایک کمپنی میں مزدور رکھا گیا تو وہاں بھی اُس نے انتھک محنت سے کام کیا.ایک دن اُس کمپنی کے مینیجر نے اُسے دیکھا تو اُسے "عاصم"میں موجود لگن بہت پسند آئی اُس نے "عاصم" کو کمپنی میں بہت اچھی جگہ نوکری دے دی,جہاں اُس کی آمدنی چالیس سے پچاس ہزار تھی.اُس کی بہنوں کےرشتےبھی اچھے گھروں میں ہو گےاور اُس کے گھر سے غربت کا سایہ بھی اُٹھ گیا.وہ اپنی زندگی خُدا کا شُکرادا کرتےہوےسکون سے گزارنے لگے. ختم شد (اُمِ حبیبہ سعید)

....